آدم خور چیونٹیاں

آدم خور چیونٹیاں

بلیغ الدّین جاوید

سنہ ۱۹۷۱ء

ستارۂ ادب

شاہ عالم مارکیٹ

دیباچہ

آدم خور چیونٹیاں

حقیقی کہانیوں کے سلسلے کا دوسرا ناول ہے۔

یہ ناول گو ہمارے ملک کے ماحول سے تعلق نہیں رکھتا۔۔۔ مگر اس ناول کے کردار ہمارے ملک کے کردار ہیں۔ آج اس سائنسی دور میں جب فاصلے سمٹ گئے

ہیں اور دنیا بھر کا ماحول گویا ایک ہی معاشرے کا ماحول بن کر رہ گیا ہے۔۔۔ کسی ملک کو دوسرے ملک کا ماحول اجنبی ماحول محسوس نہیں ہوتا۔۔

اور یوں بھی یہ ایک نیچرل کہانی ہے۔ اور اس کا مرکزی کردار وہی ننّھی سی سیاہ چیونٹیاں ہے جسے آپ پاؤں تلے مسل دیں تو آپ کو احساس تک بھی نہیں ہوتا کہ آپ نے ایک جان دار کی جان لے لی ہے اور یہ چونٹی بے چاری اپنی بربادی پر احتجاج بھی تو نہیں کر سکتی۔ دنیا کی بے ضرر ترین مخلوق میں چیونٹی کو اولیت حاصل ہے۔ مگر جب یہی ذرا ذرا سی چیونٹیاں مل بیٹھتی ہیں تو ایک ایسا عظیم خطرہ بن جاتی ہیں جس سے نمٹنے کے لیے بعض اوقات انسانی طاقت بھی خود کو کمزور محسوس کرتی ہے۔

آسٹریلیا ایک ایسا ملک ہے جہاں حشرات الارض اور رینگنے والے جانوروں کی تعداد دنیا میں کسی بھی خطّے سے زیادہ ہے اور بعض اوقات یہ جانور بھوک سے تنگ آکر شہری آبادیوں پر حملہ کر دیتے ہیں۔ اور انہیں تہس نہس کر کے رکھ دیتے ہیں۔۔۔۔

کیا ایسا ممکن ہے؟

اس سوال کے جواب میں یہ ایک کہانی ہے۔ جس کا مرکزی خیال انگریزی کے ایک ناول سے ماخوذ ہے۔ اور اس واقعہ پر بنائی گئی فلم نے دنیا کے اکثر ممالک میں پسندیدگی کے نئے ریکارڈ قائم کر دیے تھے۔

ناول ملاحظہ فرمایئے۔۔ اور اپنی رائے دینا نہ بھولئے۔

۱

چیونٹی۔۔۔۔

بہت چھوٹا سا جانور ہے۔۔۔۔

مگر قدرت نے اسے بڑی طاقت بھی عطا کی ہے۔۔۔۔ خود کما کر کھانے والے جانوروں میں یہ سب سے محنتی اور رینگنے والے کیڑے مکوڑوں میں یہ سب سے دلچسپ جانور شمار کیا جاتا ہے اور سب سے چھوٹا نہیں تو بہت چھوٹا شمار ہوا

ہے۔۔۔ محاورہ ہے کہ چیونٹی ہاتھی کو ہلاک کر دیتی ہے۔ یہ ہاتھی کو ہلاک کر دیتی ہو یا نہیں مگر جب یہ بہت زیادہ تعداد میں جمع ہو جائیں تو ہاتھی بھی ان سے پناہ مانگتا ہے۔۔۔

چیونٹیاں آدم خور کم ہی ہوا کرتی ہیں۔ اور ایسا واقع بہت کم ہوا ہے کہ چیونٹیوں نے زندہ انسانوں کو کھا لیا ہو۔۔۔ ہماری اس کہانی میں ایسی ہی چیونٹیوں کا حال بیان کیا گیا ہے جو زندہ انسانوں کو چٹ کر گئیں۔۔۔ اور ان کی دستبرد سے انسان تو انسان حیوان بھی نہ بچ سکے۔۔۔

چیونٹیوں کے اپنے رسم و رواج ہوتے ہیں اور ان رسم و رواج میں سب سے اہم یہ ہے کہ یہ ایک باقاعدہ اور نظم و ضبط رکھنے والی زندگی بسر کرتی ہیں۔ ایک چیونٹی پر اگر کوئی آفت آئے تو ایک قطار میں چلنے والی سبھی چیونٹیوں کو پل بھر تیں اس کی خبر مل جاتی ہے۔ یہ منہ سے منہ جوڑ کر نہ جانے ایک دوسری سے کیا کہتی ہیں کہ آخری سرے تک پل بھر میں خبر پہنچ جاتی ہے۔

مگر جن چیونٹیوں سے ندیم کو پالا پڑا وہ عجیب تھیں۔ چیونٹیوں کے لشکر اکثر ایسے علاقوں میں گھومتے رہتے ہیں جہاں ویرانی ہو اور انسان کا گزر کم ہے۔

وہاں ان کو خوراک بھی میسّر آ جاتی ہو اور ان کو پاؤں تلے روندنے والے بھی کم ہوں۔ جنگلی درندے اکثر ان کو پاؤں تلے روند دیتے ہیں۔ مگر جب یہ لشکر کی صورت میں ہوں اور کوئی جنگلی جانور ان کے قابو میں آ جائے تو یہ چیونٹیاں اس کے لیے مصیبت کا باعث بن جاتی ہیں۔ اور اسے پل بھر میں چٹ کر جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے جن علاقوں میں ان کے لشکر کے لشکر گھومتے رہتے ہیں درندے اس علاقے کا رخ بھی نہیں کرتے اور ان کو دیکھ کر دم دبا کر بھاگ جاتے ہیں۔

شیر جیسا طاقت ور جانور بھی ان سے خوف کھاتا ہے اور ان کا راستہ چھوڑ دیتا ہے کیونکہ وہ طاقت کے بل بوتے پر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا یہ ننھے ننھے کیڑے اسے چمٹ جاتے ہیں اور اسے ہلاک کر دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے جن علاقوں میں یہ بسیرا کرتی ہیں وہاں کوئی پرندہ یا درندہ نہیں رہتا گھروں میں رینگنے والی چیونٹیاں بڑی شریف ہوتی ہیں۔ مگر یہ بھی کم شرارتی نہیں ہوتیں۔ جونہی آپ کسی چیز کو کھلا چھوڑ دیں یا ان کے مطلب کی کسی چیز کو ان کی زد میں آنے دیں یہ اسے اپنا حق خیال کرتی ہیں اور اس پر دھاوا بول دیتی ہیں۔

چیونٹی بہت عقل مند جانور ہے۔ اس کے بارے میں ایک کہاوت مشہور ہے کہ

ایک دفعہ ایک بادشاہ نے پوچھا کہ تم کتنا کھاتی ہو۔ اس نے جواب دیا۔ ایک تولہ بھر اناج سال بھر میں۔

چنانچہ بادشاہ نے اسے آزمانے کا ارادہ کر لیا۔ اس نے چیونٹی کو ایک مرتبان میں قید کر دیا اور ایک تولہ اناج اس میں ڈال دیا۔

چیونٹی ایک سال مرتبان ہی میں رہی۔

ایک سال کے بعد بادشاہ نے چیونٹی کو مرتبان میں سے نکالا تو دیکھا اس نے آدھا تولہ اناج کھایا تھا اور آدھا تولہ ابھی باقی تھا۔ بادشاہ بڑا ناراض ہوا۔ اس نے چیونٹی سے کہا۔

تم نے جھوٹ بولا تھا۔ تم تو صرف آدھا تولہ اناج کھا سکی۔

چیونٹی نے دست بستہ عرض کی۔

حضور یہ بات نہیں۔ دراصل میں ایک ہی تولہ اناج کھا سکی تھی مگر میں نے نصف بھوک رکھی اور نصف کھایا۔ کیونکہ میں نے سن رکھا تھا انسان بھول بھی جاتا ہے۔ اگر آپ بھول جاتے اور سال بھر مزید مجھے باہر نہ نکالتے تو میں ایک سال

اور زندہ رہ سکتی تھی۔ ایک اور مثال ہے کہ ایک جھینگر اور ایک چیونٹی دوست تھے۔ بہار کا موسم تھا۔ وہ اکٹھے گھوما کرتے۔

جھینگر کا کام تھا کہ وہ خوراک کھاتا اور اِتراتا مگر چیونٹی شب و روز خوراک جمع کرتی اور بہت کم کھاتی۔

بہار کا موسم گزر گیا اور برسات کا موسم آگیا۔ چیونٹی نے اپنے بل میں چھ ماہ کے لیے پناہ لے لی۔ وہ آرام سے بل میں رہتی اور خوراک کھاتی مگر جھینگر بھوک سے مرنے لگا۔ برسات میں سردی اور بھوک سے اس کا برا حال ہو گیا تو اسے چیونٹی یاد آئی۔ اس نے چیونٹی سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ وہ چیونٹی کے پاس گیا اور کچھ خوراک ادھار مانگی۔ مگر چیونٹی نے انکار کر دیا۔ اس نے کہا۔

جاؤ ناچو گاؤ۔ اور وقت برباد کرو۔ تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہاری امداد کی جائے۔

چنانچہ وہ مایوس لوٹ گیا۔

اس بات سے اس کیڑے کی سنگدلی بھی ظاہر ہے۔۔۔ اور دور اندیشی بھی۔

چیونٹیاں مختلف قسم اور سائز کی ہوتی ہیں۔ یہ سیاہ، بھوری اور سرخ ہوتی ہیں۔ اور

سرخ چیونٹیاں ان میں سب سے خطرناک قرار دی گئی تھیں۔ ان میں زہر بھی ہوتا ہے۔ یہ کسی انسان کو کاٹ لیں تو وہ بلبلا اٹھتا ہے۔

یہاں بھی ایسی ہی خطرناک اور نسبتاً زہریلی چیونٹیوں کا ذکر ہے جنھوں نے بھوک سے تنگ آکر شہروں پر حملے شروع کر دیے تھے۔ وہ آبادیوں کے قریب کا سارا سبزہ اور غلّہ چٹ کر گئیں اور جب انہیں یہ بھی نہ ملا تو انہوں نے انسانوں اور حیوانوں پر حملے شروع دیے اور ان کو بھی کھا گئیں۔

مگر انسان کا ذہن بڑا عجوبہ ہے۔ اس نے ہر چیز پر ہمیشہ فتح حاصل کی ہے۔ چنانچہ انسانوں نے ان پر بھی فتح حاصل کی اور بالآخر وہ کامیاب رہے اور ان آدم خور چیونٹیوں کو بھاگتے ہی بن پڑی۔ اور انسان نے اپنے تجربے اور عقل سے انہیں ختم کر دیا۔

۲

دریا پر پل باندھ کر ایک چھوٹا سا ڈیم بنایا گیا تھا۔ فارم سے دو میل دور۔۔۔ پہاڑی علاقہ تھا جہاں بے شمار ندی نالے اور ایک چھوٹا سا دریا بہتا تھا۔ اس دریا کا پانی زمینوں کو سیر اب کرنے کی بجائے ضائع چلا جاتا تھا۔۔۔ اور بہت کم پانی استعمال میں آتا تھا۔ یوں بھی جب موسم گزر جاتا تو ندی نالے اور دریا خشک ہو جانے کی وجہ سے پانی دستیاب نہ ہوتا تھا اور ایسے حالات میں زمینوں کو مستقل طور پر زیرِ کاشت لانا آسان کام نہ تھا۔ چنانچہ اسی مسئلے کا حل حکومت نے تلاش کیا تھا اور

وہاں پہاڑیوں کے درمیان بڑے بڑے بند باندھ کر ڈیم بنا لیا گیا تھا جہاں پانی جمع رہتا تھا اور پھر ضمنی نہروں اور نالوں کی مدد سے ارد گرد کی زمینوں کے علاوہ دور دراز علاقوں میں بھی پانی پہنچ سکتا تھا اور سال بھر زمین سیراب ہونے کے علاوہ بجلی بھی بنائی جاتی تھی۔

جب ان پہاڑیوں کے درمیان ڈیم موجود نہ تھا تو ارد گرد کی زمینوں کی مالیت بہت کم تھی کیونکہ سال بھر وہ فصل نہ دے سکتی تھیں۔ مگر جونہی ان علاقوں میں پانی عام ہونے کی امید پیدا ہوئی تو زراعت پیشہ لوگوں نے اس جانب توجہ کی۔ اور بیکار اور سستی زمینیں بھی نسبتاً اچھے داموں فروخت ہونے لگیں۔

ندیم بھی ایسے ہی لوگوں میں سے ایک تھا جس نے ابتدا ہی میں مستقبل کو درخشاں دیکھ کر اس جانب توجّہ دی اور ایک بڑا قطعہ اراضی خرید لیا۔

وہ غلّے کا کاروبار کرتا تھا جبکہ اس کا باپ جو کچھ ہی عرصہ قبل کسی حادثہ میں وفات پا چکا تھا زمین ٹھیکے پر لے کر کاشت کاری کرتا رہا تھا۔ باپ کے اس جانب رجحانِ طبع کے سبب اسے بھی زراعت میں کافی تجربہ حاصل ہو چکا تھا۔ غلّے پر جب حکومت نے کنٹرول کر دیا تو یہ کاروبار اتنا نفع بخش نہ رہا تھا چنانچہ اس نے اپنا

سرمایہ سمیٹ کر اس طرف لگا دیا۔ اس کا پروگرام کاشت کاری کے علاوہ مویشی پالنا اور ان کی تجارت کرنا تھا۔ یوں بھی اس علاقے میں گھوڑے اعلیٰ نسل کے تھے۔ اور ان کی نسل کشی سے کافی نفع ہونے کی امید تھی۔

جلد ہی اس نے فارم میں بھی ایک مکان، مویشیوں کا اصطبل اور باڑے بنانے کے علاوہ ملازمین کے کوارٹر بھی بنا لیے اور جب وہ اپنے دو بچوں اور خوبصورت بیوی نسرین کے ساتھ اس فارم میں منتقل ہوا تو سبھی بے حد خوش تھے۔ علاقہ سر سبز تھا، گو شہر سے دور تھا مگر یہاں وہ گھوڑوں پر شہر جا کر اپنی ضروریات خرید سکتے تھے۔ جلد ہی اس نے ٹریکٹر بھی خرید لیا۔ بند مکمل ہو چکا تھا اور اب وہ اس علاقے میں باقاعدہ پانی سپلائی کرنے لگا تھا۔ قسمت نے یاوری کی تھی اور زمینوں کے علاوہ مویشیوں سے بھی اچھی آمدنی ہونے کے سبب وہ خُوش وخُرّم تھے۔

مگر ندیم اتنا لاپرواہ نہ تھا کہ اپنے وسیع فارم کو جو سرمایۂ حیات تھا آفات سے بچانے کا انتظام نہ کرتا۔ اس علاقے میں سانپ، بچھو، چوہے اور دیگر رینگنے والے جانور بڑی تعداد میں تھے۔ بعض اوقات ایسا ہو چکا تھا کہ وہ بھوک سے تنگ آکر بڑی تعداد میں کسی بھی فارم پر حملہ کر دیتے اور پھر اس فارم کے علاوہ وہاں

لوگوں کی تباہی یقینی تھی۔ یہ بھی تھا کہ ندیم کا فارم دوسرے سبھی فارموں سے بالکل الگ تھلگ اور سب سے پہلے تھا۔ جنگل کی طرف سے جو بھی یلغار ہوتی اس کا نشانہ سب سے پہلے وہی بنتا۔ جنگلی درندوں کا بھی ڈر تھا۔ دوسرے فارموں والے تو نظر انداز بھی کر سکتے تھے مگر ندیم کو بہر حال نقصان برداشت کرنا پڑتا۔ چنانچہ اس نے فارم کے چاروں طرف کافی گہری اور چوڑی خندق کھودی تاکہ وہ آفات سے بچ سکے۔

کسی بھی متوقع آفت کے وقت وہ اس خندق کو پانی سے بھر دیتا۔ اس طرح اس کا فارم محفوظ رہتا تھا۔ رینگنے والے جانوروں اور جنگلی درندے بھی اس خندق کو عبور نہ کر سکتے تھے۔ اور یہ خندق چور اُچکّوں سے اس کی حفاظت کرتی تھی۔

جب اسے کافی آمدنی ہونے لگی تو اس نے ترقّی کی جانب ایک قدم اٹھایا۔ اس نے اپنے فارم میں پٹرول کا ذخیرہ رکھنا شروع کر دیا جس سے وہ موٹر گاڑیوں اور ٹریکٹروں کے لیے پیٹرول سپلائی کرتا۔ اس کام کے لیے گو اسے زائد عملہ رکھنا پڑا مگر وہ مطمئن تھا۔ بہر حال اس کی آمدنی میں اضافہ ہو گیا اور ارد گرد کے فارم والوں کو دور دراز علاقے سے پیٹرول خریدنے کی زحمت سے نجات مل گئی۔ اس

طرح ایک یہ بھی فائدہ ہوا تھا کہ اس کے دوسرے فارم والوں سے مراسم استوار ہو گئے تھے اور وہ اس علاقے کا مقبول سرکردہ فرد بن گیا تھا۔

بچوں کی تعلیم کے لیے اسے بہرحال سوچنا تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد اس نے ایک جیپ خرید لی اور بچوں کے لیے ایک زائد ملازم بھی رکھنا پڑا جو صبح بچوں کو سکول لے جاتا اور چھٹّی کے وقت واپس لاتا۔ اس طرح وہ خود کو دنیا کا بہت خوش قسمت انسان خیال کرنے لگا تھا اور حقیقت میں تھا بھی یہی۔ اس نے کافی ملازم رکھ چھوڑے تھے۔ وہ اس کے فارم کا سارا کام سنبھالتے تھے اور وہ خود صرف نگرانی کرتا تھا۔ مگر وہ خود بھی محنتی شخص تھا۔ جب بھی کوئی ملازم چھٹی پر ہوتا وہ اس کا کام خود سنبھال لیتا کیونکہ وہ مالک تھا اور اس نے اپنا نفع نقصان خود سوچنا تھا اور یہ بھی اس کی خوش قسمتی ہی تھی کہ اس کے ملازم اس کے وفادار تھے۔

مگر گزشتہ کئی دنوں سے وہ کچھ کھویا کھویا سا رہتا تھا۔ اس کی وجہ آدم خور چیونٹیوں کی یلغار تھی۔

اس علاقے میں جیسا کہ قبل ازیں بتایا جا چکا ہے آدم خور چیونٹیاں کافی تعداد میں

موجود رہتی تھیں اور جنگل سے نکل کر ان کا نو میل لمبا ایک لشکر شہر کی جانب بڑھ رہا تھا۔ گو اس لشکر کا رُخ اس کے فارم کی طرف نہ تھا مگر رینگنے والے ان کیڑوں مکوڑوں کا کوئی اعتبار بھی نہ تھا۔ وہ جب بھی چاہتے اس کے فارم پر یلغار کر سکتے تھے اور چلتے چلتے اپنا رُخ موڑ سکتے تھے۔ اس نو میل کے لشکر میں کروڑوں چیونٹیاں تھیں۔

سرخ اور سیاہ رنگ کی یہ قدرے موٹی چیونٹیاں اس قسم کی تھیں جو اگر انسان کو کاٹ لیں تو وہ بلبلا اٹھتا تھا۔ اور ان کے خوف سے ہی انسان کا دم خشک ہو جاتا تھا۔

اخبارات میں ان چیونٹیوں کے بارے میں بڑی دلچسپ خبریں چھپ رہی تھیں۔ ان میں یہ خبریں بھی تھیں کہ ان چیونٹیوں کے راستے میں انسان یا حیوان بھی آ گئے تو انہوں نے انہیں چٹ کر لیا۔ مگر یہ بات یقینی تھی کہ یہ بھوکا لشکر جدھر سے گزرتا تھا درختوں کے پتے اور سبزہ تک چٹ کر جاتا تھا۔ اخباروں نے ان چیونٹیوں کے جو فوٹو چھاپے تھے وہ خوفزدہ کر دینے والے تھے۔

گو ندیم کو بھی ان چونٹیوں سے خطرہ تھا مگر وہ یہ سوچ کر مطمئن تھا کہ وہ ابھی

بہت دور تھیں اور ان کا رُخ شہر کی جانب تھا۔ جہازوں سے دوائیں چھڑکنے اور دیگر اقدامات کرنے کے بعد بھی حکومت ان چیونٹیوں کی یلغار کو روکنے میں ناکام رہی تھی۔ چنانچہ حکومت کی طرف سے اس اعلان نے لوگوں کے خوف وہراس میں اضافہ کر دیا تھا کہ وہ خود اپنا بچاؤ کر لیں۔

مگر اس کا یہ مطلب بھی نہ تھا کہ حکومت خاموش تماشائی بنی ہوئی تھی بلکہ حکومت نے ان چیونٹیوں کے خاتمے کے لیے غیر ممالک سے بھی مشورے شروع کر دیے تھے۔

ان سب باتوں سے قطع نظر یہ بات یقینی تھی کہ یہ آدم خور چیونٹیاں بہت بڑا خطرہ تھیں اور ان سے نمٹنا اس وقت کا بہت بڑا مسئلہ تھا۔

۳

ابھی سورج طلوع بھی نہ ہوا تھا۔۔۔ ندیم رات دیر سے سویا تھا۔۔۔۔ اس نے ابھی ابھی فصل کی کٹائی کروائی تھی۔ اور غلّے کو رات گئے ہی بوریوں میں بھرنے کے بعد وہ تھک گیا تھا۔ اس نے ملازموں کو دوسرے دن چھٹی دے دی تھی تاکہ وہ اس تھکا دینے والا کام کرنے کے بعد آرام کریں۔۔۔۔۔۔ اس نے رات سونے سے پہلے اپنی بیوی نسرین سے کہا تھا کہ وہ دو دن بعد منڈی میں غلّہ فروخت کرنے جائے گا اور اگر وہ بھی چاہے تو اس کے ساتھ چلے تاکہ وہ اپنی کچھ

ایسی ضرورت کی چیزیں خرید سکے جن کا وہ روز مطالبہ کر رہی تھی۔ وہ سونے سے پہلے بہت خوش تھا۔

دوسرے اخبار کی یہ خبر تھی کہ چیونٹیوں نے اپنا رُخ بدل دیا ہے۔ اب ان کے لشکر کا رُخ شہر کی جانب نہیں ہے۔ اس نے یہ سوچا بھی نہ تھا کہ اُن کا رُخ ان کے فارم کی طرف ہو گا۔ اس خبر سے وہ خوش ہو گیا۔ اس نے سمجھا کہ شاید چیونٹیاں جنگل کی جانب لوٹ گئی تھیں۔ جیسا کہ بعد میں ہوا یہ اس کا خیال تھا۔۔۔

علی الصبح سورج طلوع ہونے سے پہلے نسرین جاگ گئی۔ اس کی وجہ بچے کی طبیعت تھی۔ وہ کئی دن سے کھانسی میں مبتلا تھا۔ اور رات اس کی لپیٹ میں آنا تھا۔

مگر یہ تو پانی کی آواز بھی نہ تھی۔

کچھ پرندے آوازیں نکالتے ہوئے اُڑے تھے۔ اتنی صبح پرندے کم ہی اڑا کرتے ہیں۔ ابھی تو سورج بھی طلوع نہ ہوا تھا اور پھر ان پرندوں کی آوازیں بھی اسے یوں لگیں جیسے وہ چیخ رہے ہوں۔ اور ان کی آوازوں میں خون گھُلا ہوا ہو۔

وہ بڑی دیر اس سرسراہٹ کو سنتی رہی۔ اگر بند ٹوٹ گیا ہو تو اب تک پانی کا وہاں پہنچ جانا یقینی تھا۔ اس نے زمین کو چھو کر دیکھا وہ بدستور خشک تھی۔ فارم میں اس کے علاوہ اور سب سو رہے تھے۔

اچانک بچہ پھر کھانسا۔۔۔

غنودگی کی حالت میں ندیم نے کروٹ لی۔ یہ ندیم کو مخاطب کرنے کا اچھا موقعہ تھا۔

اس نے کہا۔

"ندیم ندیم۔ کیا تم جاگ رہے ہو؟"

ذرا سی آنکھیں کھول کر وہ بولا

"ہاں کیا بات ہے؟"

"یہ آواز تم سن رہے ہو۔ جیسے بند ٹوٹ گیا ہو۔"

ایک دم وہ پوری طرح بیدار ہو گیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے غور سے آواز سنی۔

اور پھر قہقہہ لگا کر بولا۔

"ڈارلنگ اگر بند ٹوٹ جاتا تو دو منٹ میں اس کا پانی ہمارے فارم تک پہنچ جاتا۔ پانی کے بہنے کی آواز بہت تیز ہوا کرتی ہے۔ یہ بند نہیں ٹوٹا۔"

"تو پھر یہ آوازیں کیسی تھی؟"

وہ بولی۔

"سناٹے میں ایسی آوازیں آیا ہی کرتی ہیں۔ یہ زمین کی گردش کی صدائے بازگشت ہوا کرتی ہے۔"

وہ لاپرواہی سے بولا۔ اور پھر اس نے کہا۔

"بچے کو صبح ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہو گا۔ اس کی طبیعت زیادہ خراب نہ ہو جائے۔"

"ہاں۔۔۔۔"

وہ نہ جانے کیوں فکر مند سی تھی۔ اس نے اسی قدر کہا۔ ندیم کروٹ بدل کر سو

گیا۔ وہ بہت تھکا ہوا لگتا تھا اور یوں بھی صبح کو نیند زیادہ آیا کرتی ہے۔

اچانک وہ پھر چونک اٹھی۔۔۔

آواز زیادہ ہو گئی تھی۔ یوں جیسے بے شمار سانپ ان کے کمرے کے ارد گرد رینگ رہے ہوں۔ اس سے رہا نہ گیا۔ اس کا دل نہ جانے کیوں بار بار یہ کہہ رہا تھا کہ کوئی خطرہ فارم کی جانب رینگ رہا تھا۔ بچہ بڑی دیر تک کھانستا رہا تھا۔ علی الصبح وہ پھر کھانس رہا تھا۔ نسرین کی آنکھ کھل گئی۔

بچہ بدستور سو رہا تھا مگر ماں کو جاگنے کے بعد دوبارہ نیند نہ آ رہی تھی۔ یوں ہی وہ شوہر کو دیکھتی رہی۔ اسے ندیم پر بڑا پیار آیا جو ان کے لیے بہت محنت کرتا تھا تاکہ وہ زیادہ آرام سے رہ سکیں۔ وہ بچے کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی اور ذہن میں ان چیزوں کی فہرست بناتی رہی جو شہر سے خریدے گی۔ کسانوں کی زندگی میں سال بھر میں بہت کم مواقع ایسے آتے ہیں جب وہ خرید و فروخت میں دل کھول کر روپیہ صرف کرتے ہیں اور یہ مواقع ان ہی دنوں آتے ہیں جب ان کی فصل پکتی ہے اور کٹائی کر کے اسے فروخت کر دیتے ہیں۔

اور پھر نسرین اچانک چونک سی پڑی۔ کچھ آوازیں آرہی تھیں۔

یوں جیسے مدہم مدہم سا کوئی سُر بج رہا ہو یا سنّاٹے میں جیسے زمین کی گردش کی آواز سنائی دے جائے۔ مگر یہ نہ تو ساز کی آوازیں تھیں اور نہ ہی زمین کی گردش کی۔ یوں آوازیں سنائی دے رہی تھیں جیسے پانی مدھم آواز میں بہہ رہا ہو۔ بڑی دیر وہ سنتی رہی۔ اسے یوں لگا جیسے یہ پانی کے بہنے کی آواز ہو۔ وہ کانپ گئی۔

بڑا بند قریب ہی تو تھا۔ اور اس میں کسی بھی وقت حادثہ سے سوراخ ہو سکتا تھا۔ اور اگر ایسا ہو جاتا تو سب سے پہلے ان ہی کا فارم اور وہ سب سخت خطرے میں ہیں۔ اس نے بچے کو سینے سے لگالیا اور پھر وہ آہستہ سے بولی۔

”ندیم۔۔۔ ندیم اٹھو۔۔۔۔“

مگر ندیم سو گیا تھا۔

اس نے خاوند کو جھنجوڑا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھا اور تلخ لہجے میں بولا۔ ”کیا ہے؟ کیوں پریشان کر رکھا ہے۔۔۔؟“

”اٹھو دیکھو یہ آواز کیسی ہے؟“

وہ خوف زدہ سی آواز میں بولی۔

ندیم اچانک پوری طرح بیدار ہو گیا۔ نسرین نے کبھی اس باتیں تو نہ کی تھیں اس نے سوچا۔

ضرور کوئی بات ہے جو نسرین اتنی گھبرائی ہوئی ہے۔ یوں بھی عورت جب ماں بن جاتی ہے تو اسے خطرے کا احساس زیادہ ہو رہا ہے اور اپنے بچوں کی حفاظت کے لیے وہ زیادہ احتیاطی اقدامات کرتی ہے۔ اس نے کان لگا دیے اور پھر بولا۔

"ہاں یہ کوئی خاص آواز ہے۔"

"تو اٹھو دیکھو یہ کیا ہے۔" وہ بولی۔

وہ بستر سے اٹھا۔ نسرین نے بچے کو بستر پر لٹایا اور وہ بھی اٹھی۔ جونہی انہوں نے دروازہ کھولا آواز زیادہ آنے لگی۔ وہ باہر لپکا اور ارد گرد گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ سورج طلوع ہو رہا تھا اور کائنات روشن ہو رہی تھی مگر ہاں کچھ بھی تو نہ تھا۔ پھر یہ آوازیں کیسی۔ حیرانی سے وہ دونوں میاں بیوی اس آواز کا سبب جاننے کی فکر میں تھے اچانک نسرین چیخ اٹھی۔

”کیا ہے۔۔۔۔؟“ وہ بولا

”کچھ نہیں۔“ وہ کھسیانی سی ہو کر بولی۔ ”چیونٹی نے مجھے کاٹ لیا تھا۔“

وہ مسکرا دیا مگر پھر وہ ایک دم سے سنجیدہ ہو گیا۔

فارم میں ارد گرد بے شمار چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ اور ان میں سے کچھ نے اس کے بوٹوں پر چڑھنا شروع کر دیا تھا۔ ایک دم سے اس کا خیال ان اخباری خبروں کی جانب گیا جو روز آ رہی تھیں کہ اربوں چیونٹیوں کا لشکر جو سبزہ اور انسانوں تک کھا جاتا ہے اس جانب بڑھ رہا ہے۔

خوف زدہ آواز میں وہ بولا۔ ”چیونٹیوں کا لشکر آن پہنچا۔ نسرین ہم سب سخت مصیبت میں گھِر گئے ہیں۔ شاید ہم سب تباہ ہو جائیں۔“

خون سے نسرین کے منہ سے آواز نہ نکل سکی۔ وہ بھاگا بھاگا گیا اور اس نے ملازموں کے کوارٹروں پر دستک دینی شروع کر دی۔

سبھی ملازم جاگ اٹھے۔ اور جب انہیں اصل حالات کا علم ہوا تو وہ خوف زدہ ہو گئے۔ ان کے چہرے اتر گئے اور رنگ فق ہو گئے۔ وہ گم سم کھڑے تھے۔ ندیم نے مایوسی اور عزم سے انہیں مخاطب کیا۔ ”ساتھیو۔ چیونٹیوں نے فارم کا گھیراؤ کر لیا ہے۔ بچت کی کوئی راہ نہیں۔ آپ میں سے جو بھاگنا چاہے وہ ایسا کرنے کا مجاز ہے مگر یہ موت کو دعوت دینے کے مترادف ہو گا۔ میں آپ سب کو مشورہ دوں گا کہ آپ اور میں مل کر اس خطرے کا مقابلہ کریں۔ بزدلوں کی طرح مرنا مردانگی نہیں۔

پہلے تو ملازم شش و پنج میں رہے۔

مگر پھر بجھے دل سے انہوں نے اس خطرے کا مقابلہ کرنے کی حامی بھر لی۔ وہ بہر حال خود کو اس خطرے سے بچانا فرض خیال کرتے تھے۔ مگر سبھی کے دل دھڑک رہے تھے۔

ننھے ننھے کیڑوں کے مقابلے میں چاند کو فتح کرنے والا انسان خود کو بے بس خیال کرتا تھا۔

۴

سورج پوری طرح طلوع ہو چکا تھا اور سورج کی روشنی میں ان لوگوں نے جو دیکھا وہ دل دہلا دینے کیلیئے کافی تھا۔ فارم کے چاروں طرف گو ایک گہری خندق کھدی ہوئی تھی مگر انہوں نے دیکھا ارد گرد کا تمام علاقہ سیاہ ہو چکا ہے۔ بے شمار سیاہ اور موٹی تازی چیونٹیاں ہر جانب پھیلی ہوئی ہیں۔ اور وہ اتنی تعداد میں ہیں کہ زمین چھپ کر رہ گئی ہے۔ مگر ان کا قافلہ رکا نہ تھا۔

انہوں نے خندق کو بھی خاطر میں لائے بغیر اپنی جاری پیش قدمی رکھی۔ وہ بہت

سست روی سے بڑھ رہی تھیں۔ ابھی بہت کم چیونٹیاں فارم میں داخل ہوئی تھیں۔ گویا جو فارم میں داخل ہوئی تھیں وہ ایک ہراول دستہ تھا۔ اور بقیہ ان کے پیچھے اب پہنچی تھیں۔

وہ تعداد میں اتنی زیادہ تھیں کہ ان کے چلنے سے آواز پیدا ہو رہی تھی جسے پہلے نسرین نے بند کا پانی خیال کیا تھا۔ چیونٹیاں بڑے نظم و ضبط سے چل رہی تھیں۔ ان کے اگلے دستے کے بعد کچھ زمین خالی تھی۔ وہ تقریباً آدھ فرلانگ کا فاصلہ تھا۔ ابھی ہراول دستہ ہی تھا جو چند گز زمین پر پھیلا ہوا تھا فارم تک پہنچا تھا۔ گویا وہ لشکر ایک مکمل نظم و ضبط کے ساتھ جیسے فوجیں چڑھائی کرتی تھیں بڑھ رہا تھا۔ ہراول دستے نے خندق میں اتر کر خندق کی دیواروں پر چڑھ چڑھ کر اسے عبور کرنا شروع کر دیا تھا اور وہ فارم میں داخل ہو رہی تھی مگر وہ تعداد میں اتنی نہ تھیں کہ مصیبت بن جاتیں۔ اصل لشکر تو بعد میں آ رہا تھا اور دراصل اسی سے بچاؤ کرنا ضروری تھا ورنہ سب کی موت یقینی تھی۔

اخبارات اور ریڈیو کے ذریعے اس سے پہلے کہ یہ خبریں آ چکی تھیں کہ چیونٹوں کا یہ خونخوار لشکر جس کا راستہ درندوں نے بھی چھوڑ دیا تھا نو میل میں پھیلا ہوا تھا۔

اور اتنا بڑا لشکر اگر فارم پر یلغار کر دیتا تو یہ بھوکی چیونٹیاں منٹوں میں سب کچھ چٹ کر جائیں۔

ندیم نے اپنے ملازموں کو جمع کیا اور ان سے مشورہ کرنے لگا کہ ایسے حالات میں انہیں کیا کرنا چاہیئے۔

سوچ بچار کے بعد یہ ہوا کہ وقت کم ہے۔ باہر سے امداد منگوانا مشکل ہے۔ کسی نہ کسی صورت اگر فارم چھوڑ دیا جائے تو ان سب کی محنت پل بھر میں ضائع ہو جائے گی اور تباہی کے بعد انہیں سنبھلنے میں مدّت لگے گی۔ اپنی جانوں کے علاوہ فارم کو بچانا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ انہوں نے خندق میں پانی بھر دینے کا فیصلہ کیا۔
دو طاقتور انجن دس منٹ میں خندق کو بھر سکتے اور پھر پانی کھینچ کر خالی کر سکتے تھے۔

پانی کا کافی ذخیرہ موجود تھا جس سے کم از کم دس بار خندق کو بھرا اور پھر خالی کیا جا سکتا تھا۔ خندق کا پانی مخالف سمت میں، جدھر چیونٹیاں تھیں، گرایا جا سکتا تھا اور خود کو بچانے کے لیے ان کے پاس یہ اچھا ہتھیار تھا۔

چنانچہ دونوں انجن چالو کر دیے گئے اور انہوں نے خندق میں پانی بھرنا شروع کر دیا۔ جونہی خندق میں پانی آیا چیونٹیوں کا ہراول دستہ رُک گیا۔ انہوں نے منہ سے منہ ملائے جیسے وہ ایک دوسری کو پیغام دے رہی ہوں۔ اور پھر جو چیونٹی جہاں تھی وہاں رُک گئی۔

پانی چلتا رہا اور خندق دس منٹ میں بھر گئی۔ جونہی خندق بھری پانی بند کر دیا گیا۔ اب ان کے خیال میں خطرہ ٹل گیا تھا۔ چیونٹیاں خندق عبور نہ کر سکتی تھیں۔

خندق بھرنے کے بعد اس کی تہہ میں جو چیونٹیاں تھیں، وہ سیاہ دھبے سے بن کر پانی پر تیرنے لگیں اور ان کی تباہی کا تماشہ ۹ میل لمبے لشکر کو روکنے کے لیے کافی تھا۔

ہراول دستہ تقریباً تباہ ہو چکا تھا مگر بہت سی چیونٹیاں فارم میں گھس آئی تھیں جو پودوں کو نقصان پہنچا سکتی تھیں چنانچہ ندیم نے ملازموں حکم دیا کہ وہ کیڑے مار دواؤں سے انہیں ہلاک کریں۔

سبھی ملازم کیڑے مار دوائیں چھڑکنے لگے اور انہوں نے فارم میں گھس آنے والی

بہت سی چیونٹیوں کو تباہ کر دیا اور پھر یہ دیکھ کر ان کی خوشی کی حد نہ رہی کہ ہراول دستے کا بچا ہوا حصّہ واپس لوٹ گیا اور بڑا لشکر جو کچھ دور رُک گیا تھا اس سے جا ملا۔ ندیم نے تالی بجائی۔ نسرین اور بچّے بے حد خوش تھے۔ نہ صرف ندیم کا خاندان بلکہ ملازم اور ان کے اہل و ایال بھی اپنی اپنی کرسیاں خندق کے قریب لے آئے اور اس عجیب و غریب مخلوق کی بے بسی کا تماشا دیکھنے لگے۔ وہ بہت خوش تھے۔

خندق سے پندرہ بیس گز دور زمین بالکل کوئلے کی مانند سیاہ تھی اور زمین کے علاوہ درختوں اور پودوں تک کو سیاہ چیونٹیوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ حیرانی اور دلچسپی سے بچے تو خوش خوش ان کی نقل و حرکت دیکھ رہے تھے اور خود ندیم ان کی تصویریں اتار رہا تھا۔

نسرین نے کہا۔

”اگر میں وقت پر آپ کو بیدار نہ کر دیتی تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔“

”ہاں۔ خدا جو کرتا ہے اچھا کرتا ہے۔ شاید اسے ہماری محنت پر رحم آ گیا اور ہمیں

اس نے بچالیا۔ مگر میں سوچ رہا ہوں کہ دوسرے فارموں والوں کا کیا ہو گا۔ جن کے فارم کے گرد حفاظتی اقدامات نہیں ہیں۔"

ندیم نے فکر مندی سے جواب دیا۔

"وہ لوگ کہاں جائیں گے کیونکہ اس فارم سے مایوس ہو کر بلائیں دوسرے فارموں کا رُخ کریں گی۔" ایک ملازم نے سکون سے جواب دیا۔ ایک اور ملازم بولا۔

"میرا بھائی ساتھ والے فارم میں ملازم ہے۔ مجھے اس کی فکر ہے۔ خدا کرے انہیں خبر ہو جائے اور وہ بھاگ جائیں۔"

"وہ ضرور بھاگ جائیں گے۔ تم فکر نہ کرو۔" ندیم نے جواب دیا۔

اور وہ قہقہے لگانے لگے۔

چیونٹوں کا لشکر پھر چل پڑا تھا اور وہ پانی سے بھری ہوئی خندق کی جانب بڑھ رہا تھا۔ وہ چیونٹیوں کی بے بسی دیکھ کر لطف اندوز ہونے کے خواب دیکھ رہے تھے۔

۵

مدھم رفتار سے چیونٹیاں خندق کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ ان میں انتہائی نظم و ضبط تھا۔ وہ بے حد وقار اور انداز سے اس جانب رواں دواں تھیں۔ اگلی قطار ایسی ہی تھی جیسے کسی نے سیدھی لکیر کھینچ دی ہو جس سے آگے کسی بھی چیونٹی کو بڑھنے کی ممانعت ہو۔ البتہ چند بڑی بڑی چیونٹیاں آگے آگے تھیں اور وہ گویا ان کی سردار تھیں جو ان کی رہبری کر رہی تھیں۔

اور پھر۔۔۔

یہ لشکر خندق کے کنارے پہنچ گیا چند فٹ چوڑی اس خندق کے اس پار چیونٹیاں تھیں جو دوسری جانب موجود دو درجن افراد کے لیے پیغامِ موت تھیں اور جن کے راستے میں ان لوگوں نے خندق حائل کر دی تھی۔ آگے آنے والی چیونٹیوں نے رُک کر خندق میں منہ ڈالا اور گویا وہ پانی کا اندازہ کرنے لگیں۔ وہ فوراً پلٹیں اور انہوں نے پیچھے آنے والی چیونٹیوں کے منہ سے منہ ملایا۔ انہوں نے اپنے بعد والی چیونٹیوں کو یہ پیغام دیا اور آہستہ آہستہ یہ پیغام شاید لشکر کے آخری سرے تک پہنچ گیا۔

لشکر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پیغام جانے میں چند منٹ سے زیادہ عرصہ نہ لگا۔

لشکر رکا رہا۔ یوں جیسے وہ کوئی مشورہ کر رہی ہوں دم سادھے سارے ملازم اور مالکان فارم کی دوسری طرف سے انہیں دیکھتے رہے۔ مگر چیونٹیاں یوں رکی ہوئی تھیں جیسے وہ مسرور ہوں۔ زمین سیاہ تھی۔ اور صرف چند اگلی چیونٹیاں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔ بار بار وہ ایک دوسری کے منہ سے منہ ملاتیں جیسے وہ کوئی راستہ تلاش کرنے کے بارے میں مشورے کر رہی ہوں۔ مگر وہاں کوئی راستہ نہ

تھا۔

اچانک اگلی چیونٹیوں نے لشکر کے پیچھے آنے والی چیونٹیوں کے منہ سے منہ ملایا اور وہ پھر رواں دواں ہو گئیں مگر اس بار ان کا رُخ خندق کی جانب نہ تھا۔

خندق کے دوسرے سرے پر ندیم نے درخت لگوائے تھے۔ بڑے بڑے پتوں والے میں سبز درخت دراصل فارم کی حد بندی کرتے تھے۔ اور یوں بھی یہ سر سبز درخت فارم کی خوبصورتی میں اضافہ کا باعث تھے۔ وہ خندق کے اسی جانب تھے جدھر سے چیونٹیوں کے یلغار کی تھی۔ یہ محض اتفاق تھا۔ چیونٹیوں نے ان درختوں پر چڑھنا شروع کر دیا اور دیکھتے ہے دیکھتے درخت سیاہ ہو گئے مگر اس کے باوجود بھی وہ ان پر چڑھتی چلی گئیں۔

ندیم نے کہا۔ ”کم بخت میرے درختوں کے سارے پتّے کھا جائیں گی۔“

”پتّے تو اور بھی آ جائیں گے۔ بہر حال ہمیں خُوش ہونا چاہیے کہ ہمیں بہت کم نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔“ ایک ملازم نے کہا۔

”ہاں۔ یہ بھی ہے۔“ ندیم نے کچھ اور ہی سوچتے ہوئے کہا۔

اور پھر وہ چونک گیا۔ بے شمار چیونٹیوں نے پتّوں کو کاٹنا شروع کر دیا تھا۔ اور ایک ایک کر کے یوں درختوں سے پتّے گر رہے تھے جیسے موسمِ خزاں میں گرا کرتے ہیں۔ عجیب بات تھی کہ کچھ پتّے تو خندق میں گرتے اور بقیہ خندق کی دوسری جانب۔

جونہی کوئی پتّہ خندق کے دوسری جانب گرتا چیونٹیاں اسے دھکیل کر خندق میں گرا دیتیں۔

سبھی خوف زدہ ہو گئے کیونکہ خندق کے پانی پر اس قدر پتّے جمع ہو گئے تھے کہ گویا وہ پُل سا بن گیا تھا۔ اور اب چیونٹیاں اسے زیادہ آسانی سے عبور کر سکتی تھیں۔

اور یہی ہوا۔ چیونٹیوں نے پھر منہ سے منہ ملایا۔ اور لشکر آگے بڑھ گیا۔ انہوں نے پتّوں پر سے خندق عبور کرنا شروع کر دی۔ وہ ایک ایک کر کے پتّوں پر چڑھتی تھیں اور پھر خندق عبور کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔ وہ سب کانپ اٹھے۔ اور اس حالت میں بھی وہ ان ننھے ننھے کیڑوں کی عقل مندی کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔

پل بھر میں خندق سیاہ ہو گئی اور جونہی پہلی چیونٹی نے دوسری جانب قدم رکھا ندیم نے غصّے سے پاؤں تلے اسے مسل دیا۔ مگر وہ نو میل لمبے لشکر کو پاؤں تلے مسل کر ہلاک نہ کر سکتا تھا۔ چیونٹیاں بڑی تعداد میں دوسری جانب اترنے والی تھیں۔

اس نے ملازمین سے کہا۔

"بانس لے لو اور پانی کو ہلا کر انہیں ختم کر دو۔"

چنانچہ سبھی ملازمین نے اور خود نسرین نے اور بچوں نے بانسوں سے پانی کو ہلانا شروع کر دیا اور اس طرح پتّے پانی میں ڈوب کر ابھرتے تو صاف ہوتے۔ بے شمار چیونٹیاں مرنے لگیں اور وہ ٹکڑیوں کی صورت میں پانی کی سطح پر دھبّے بن کر رہ گئیں۔

مگر چیونٹی پانی میں اتنی جلدی مرتی بھی کہاں ہے۔ وہ پانی پر سے تیر تیر کر بھی دوسری جانب اُترنے لگیں۔ مگر ملازم اور وہ خود بانسوں سے بلا کر انہیں دور کرتے رہے۔

پتّے بدستور درختوں سے گرتے رہے۔ اور چیونٹیاں بدستور خندق پار کرنے کی کوشش کرتی رہیں۔ لاکھوں چیونٹیاں مر گئیں۔ مگر ندیم نے اندازہ لگایا کہ وہ چند انچ ہی پانی میں اتری تھیں۔ نو میل لمبا لشکر ابھی باقی تھا۔

"اب کیا ہو گا؟"

خود سے نسرین نے پوچھا۔

"ہم انہیں شکست دیں گے۔ اپنے آدمیوں اور بیوی بچوں کی حفاظت کے لیے میں خود جان دے دوں گا۔"

ندیم نے بڑے عزم سے کہا۔

"نہیں ایسا نہیں ہو گا۔ تم زندہ رہو گے۔"

نسرین اس کے سینے سے لگ گئی۔

سارے ملازم مل کر کسی نہ کسی صورت انہیں روکتے رہے۔ اور اب انہوں نے دیکھا کہ درختوں کے پتّے ختم ہو رہے تھے۔ چیونٹیاں یا تو نرم پتّے کھا گئی تھیں اور باقی کو انہوں نے خندق میں ِگرا کر پل بنانے کے کام کے لیے استعمال کر لیا

تھا۔

ندیم نے اپنے آدمیوں کا حوصلہ بلند رکھنے کو کہا۔

"دوستو کچھ اور محنت کرو۔ درخت ٹنڈ منڈ ہو جائیں گے تو ان بد بخت چیونٹیوں کا آخری سہارا بھی ختم ہو جائے گا۔ ہمیں ہمّت نہیں ہارنی چاہیے۔ بس تھوڑا کام اور باقی ہے۔

مگر اسے یہ سب کہنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ملازم خود اپنی زندگی اور بچاؤ کے لیے محنت کر رہے تھے۔ اگر چیونٹیاں ادھر یلغار کر دیتیں تو صرف ندیم اور اس کا خاندان ہی تباہ نہ ہوتا بلکہ وہ سب بھی ختم ہو جاتے کیونکہ فرار کے سارے راستے بند تھے۔ ارد گرد نو نو میل تک چیونٹیاں ہی چیونٹیاں تھیں۔

اور پھر۔۔۔۔

درختوں پر پتّے ختم ہو گئے۔ ندیم نے ملازموں کی مدد سے بیلچوں کے ذریعے سارے پتّے فارم کے اس جانب سمیٹ لیے اور پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی۔

اس طرح اس نے نہ صرف چیونٹیوں کا پل تباہ کر دیا بلکہ بے شمار چیونٹیاں بھی

ہلاک کر دیں۔ لشکر پھر رُک گیا تھا۔ آگے راستہ بند تھا۔

٦

چیونٹیوں کا لشکر چند منٹ بالکل ساکن رہا۔ انہیں یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے یہ ننھی ننھی چیونٹیوں کا ایک لشکر ہو جو ہر حالت میں انہیں ہلاک کر دینے کے درپے ہو یا یہ کہ وہ عفریت ہوں جو انہیں ختم کرنے کا فیصلہ کر چکے ہوں۔

چیونٹیوں نے پھر منہ سے منہ ملائے۔

بظاہر حالات میں وہ چیونٹی کی اس حرکت کو شاید کوئی اہمیت نہ دیتے۔ مگر اب

کے انہیں یوں معلوم ہوا جیسے کوئی بہت بڑی طاقت ان کی زندگی اور موت کا فیصلہ کرنے کا پروگرام بنا رہی ہے اور ابھی ابھی ان کی قسمت کا فیصلہ سنا دیا جائے گا۔

نہ جانے انہوں نے کیا کہا تھا۔ پل بھر میں پیغام پورے لشکر تک پہنچ گیا۔ اسی وقت انہیں ایک ایسا منظر دیکھنے کو ملا جو ان کو انتہائی خوف زدہ کر دینے کے لیے کافی تھا۔

نہ جانے جنگل میں سے ایک ہرن کہاں سے نکل آیا۔ تین فرلانگ دور سے وہ ایک ایسا سیاہ دھبّہ سا دکھائی دیتا تھا جس نے چیونٹیوں کا لباس پہن رکھا ہو۔ وہ پوری رفتار سے بھاگ رہا تھا مگر یہ رفتار اتنی چیونٹیوں کے چمٹ جانے سے ایک گھٹنوں کے بل چلنے والے بچے کی رفتار سے زیادہ نہ تھی۔ وہ اپنے بچاؤ کے لئے بھاگتا رہا۔ اس کا رُخ فارم کی طرف تھا۔ لاشعوری طور پر وہ لوگ جو فارم میں موجود تھے چاہتے کہ ہرن ان تک پہنچ جائے تو وہ اسے پناہ دیں۔ گویا اس آفت نے صرف جان دار کا سوال پیدا کیا تھا۔ انسان اور حیوان کا فرق بھی ختم کر دیا تھا۔

ہرن نے بہت سر مارا مگر فارم تک پہنچنا اس کا مقدر نہ تھا۔ چیونٹیاں اس کے ناک، کان، منہ اور ہر اس جگہ گھس گئیں جہاں انہیں راستہ ملا۔ وہ اتنی مقدار میں اس سے چمٹ گئیں کہ فارم والوں نے اس کے ہرن ہونے کا اندازہ صرف اس کے ڈیل ڈول اور سینگوں سے لگایا۔

اور پھر بے چارہ ہرن ہمّت ہار گیا۔ چکرا کر وہ گرا اور پل بھر میں چیونٹیوں سے وہ ڈھک گیا۔ لشکر رُکا رہا۔ شاید سارے لشکر میں ہرن کی آمد اور خوراک کی موجودگی کی خبر پھیل گئی تھی۔ صرف اتنی ہی چیونٹیاں اپنی جگہ سے ہلی تھیں جہاں ہرن تھا۔ وہاں چیونٹیوں کا ایک ڈھیر دکھائی دیتا تھا۔ وہ فارم سے نصف فرلانگ دور تھا۔ کھلا میدان ہونے کے سبب اتنے دور سے سب دکھائی دے رہا تھا۔ ہرن تڑپتا رہا اور پھر وہ ساکن ہو گیا۔ چیونٹیاں۔۔۔۔۔۔ ایک کی جگہ دوسری جگہ لیتی ہیں۔ پیٹ بھر کر پہلی چیونٹیاں ہرن سے دور ہٹ جاتیں اور دوسری اس کی جگہ لے لیتی۔ چنانچہ پندرہ بیس منٹ میں وہ اسے چٹ کر گئیں۔

عجیب بات تھی ان چیونٹیوں نے اس ہرن کی کھال بھی کھائی تھی۔ اور کچھ دیر بعد وہ اس سے ہٹ گئیں اور فارم والوں نے وہاں سفید سفید ہڈیوں کا ڈھیر

دیکھا۔۔۔۔ ہڈیوں پر گوشت کا ایک ذرّہ بھی نہ تھا۔ چیونٹیاں سب چٹ کر گئی تھیں۔

اس واقعے کا سبھی کے دل پر اثر ہوا۔ اپنا انجام یاد کر کے سبھی کانپ اٹھے اور نسرین تو مصیبت دور کرنے کی دعائیں کرنے لگی۔ وہ آنکھیں بند کیے کچھ پڑھ رہی تھی۔ وہ سب سے زیادہ خوفزدہ تھی۔ اس نے بچّوں کو سینے سے چمٹا رکھا تھا۔

اور پھر وہ ڈر گئے۔۔۔

چیونٹیوں نے جان کی پرواہ کیے بغیر پانی میں اترنا شروع کر دیا تھا۔ وہ پانی میں اترتیں اور بہہ جاتی تھیں۔ اس طرح پانی کی سطح پر تیرتی پھرتی تھیں۔ ملازمین نے پھر بانس سنبھال لیے۔ وہ بڑی تیزی سے پانی میں بانس چلاتے اور چیونٹیوں کو پانی میں ہلاتے۔ مگر چیونٹی وزن دار تو ہوتی نہیں جو پانی میں ڈوب جائے۔ وہ تو بے وزن جانور ہے۔ آہستہ آہستہ وہ اتنی تعداد میں پانی میں اتر گئیں کہ پانی کی سطح ان سے سیاہ ہو گئی۔ وہ اپنی زندگی کی پرواہ نہ کر رہی تھیں۔ پانی کی سطح پر ان کی وجہ سے ایک چادر سی بن گئی تھی۔ اور ہر چند ملازمین کے ہمّت کرنے کے باوجود وہ اس چادر پر سے خندق عبور کرنے لگیں۔ انہوں نے لاکھوں ساتھیوں کی قربانی دی تھی۔ اور اب باقی تمام لشکر فارم پر حملہ کرنے ہی والا تھا۔

خوف سے بچّے یوں چیخنے لگے جیسے یہ چیونٹیاں کوئی درندے ہوں۔ ملازمین نے

بانس رکھ دیے کیونکہ اب یہ بیکار کھیل تھا۔ اور وہ بھاگ جانے کے مشورے کرنے لگے۔

فارم میں جو گھوڑے موجود تھے انہوں نے گھوڑوں پر اس لشکر کو عبور کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر ندیم نے کہا۔

"دوستو مجھے گھوڑوں سے زیادہ تمہاری زندگی عزیز ہے۔ تم میں سے ایک بھی کم ہو گیا تو ہم سب اسے کبھی نہ بھلا سکیں گے۔ مگر تم نے ہرن کا انجام دیکھا۔ اس سے تیز رفتار اور کون سا حیوان ہے۔ وہ بھی اس عفریت سے اپنی جان نہ بچا سکا تو تم کیسے خود کو بچا سکو گے۔ میں تو یہ مشورہ دوں گا کہ حوصلہ رکھو۔ میں نے سب سوچ لیا ہے۔"

"مگر کیا؟"

"ہم خندق کا پانی کم کر دیں گے۔ اور دوسری جانب ان چیونٹیوں پر ڈالیں گے۔ اس سے یہ تباہ بھی ہو جائیں گی اور خطرہ بھی ٹلے گا۔" ندیم نے جواب دیا۔ سبھی جانتے تھے اور خود ندیم بھی جانتا تھا کہ وہ اس صورت اتنے بڑے لشکر کو ختم

نہیں کر سکے گا۔ مگر کوشش فرض تھی۔

سبھی نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ کیونکہ اور کوئی صورت بھی تو نہ تھی۔ ندیم نے انجن چالو کر دیے اور خندق کا پانی کم کر دیا گیا۔ انہوں نے خندق سے جو پانی کھینچا وہ دوسری جانب گرا دیا اور چیونٹیوں پر ڈالا۔ بے شمار چیونٹیاں ہلاک ہو گئیں اور فوری طور پر اس کا ردِّ عمل یہ ہوا کہ لشکر کچھ پیچھے ہٹ گیا۔

خطرہ کم ہو گیا تھا۔

مگر جونہی پانی ذرا خشک ہوا وہ پھر آگے بڑھیں۔

اب کے پانی خندق میں قدرے کم گہرا تھا۔ مگر چیونٹیوں نے اب کے بھی ہمّت نہ ہاری۔ انہوں نے اس پانی میں اترنا اور پھر اس پر تہہ در تہہ جمانا شروع کر دیا۔

ندیم کے ایک ملازم سے کہا۔

"چند منٹوں میں یہ خندق میں اتنی تعداد میں بھر جائیں گی کہ اسی پل پر سے دوسری چیونٹیاں گزر کر ادھر آسکیں گی۔

اور حقیقت میں یہی ہوا۔ چیونٹیاں گزرتی چل گئیں۔ وہ خندق کی مخالفت سمت

والی دیوار پر چڑھتی رہیں اور پھر ادھر سے ہو کر فارم پر حملہ آور ہوتی رہیں۔ یہ حوصلہ شکن بات تھی۔ جونہی چونٹیوں کی پہلی قطار نے فارم میں قدم رکھا ندیم چلایا۔

"پمپ چالو کر دو۔ اور خندق پھر بھر دو۔"

ملازم نے خندق کو دوبارہ بھر دیا۔ اور چیونٹیاں اس طرح پھر دھبّے دھبّے سے بن کر پانی کی سطح پر بکھر گئیں۔

یہ نیا حادثہ تھا۔

چیونٹیوں کا لشکر پھر رُک گیا۔ اور انہوں نے منہ سے منہ ملائے اور جونہی پانی پھر ساکن ہوا پہلے والا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سب کی سب مرنے مارنے پر تلی بیٹھی ہیں اور خود کو ختم کر کے دم لیں گی۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ وہ تو تعداد میں اتنی زیادہ تھیں کہ یہ سلسلہ سالوں چلتا رہتا تو پھر بھی وہ ختم نہ ہوتیں۔

ندیم نے ایک ملازم کو کہتے سنا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "چیونٹیاں شکست نہ مانیں گی۔ وہ

یوں کہ ہم سے لڑتی رہیں گی اور بالآخر نہیں ہمّت ہار دینا ہو گی۔ موت ہمارا مقدر بن چکی ہے۔"

یہ احمد تھا۔ وہ دوسروں سے زیادہ بزدل ملازم تھا۔ ندیم نے اسے گھور کر دیکھا اور بولا۔"میں نے کسی کو روکا نہیں ہے۔ اگر تمہیں بچاؤ یا کوئی راستہ دکھائی دیتا ہے تو بے شک بھاگ جاؤ۔ میں تمہیں منع نہیں کروں گا۔"

اور وہ یوں سوچنے لگا جیسے ان امکانات پر غور کر رہا ہو۔

اب کے ندیم نے ایک نیا سلسلہ شروع کیا۔ اس نے پانی خندق سے کھینچا اور پھر چیونٹیوں پر پھینکنا شروع کر دیا۔ زور سے پانی چیونٹیوں پر گرا تو وہ دور ہٹ گئیں۔ بے شمار تباہ ہو گئیں اور بقیہ پرے چلی گئیں۔ مگر ان کا باقی لشکر یوں ساکن رہا جیسے ایک کمان کے اشارے پر کام کر رہا ہو۔ اور انہیں حکم ملے گا تو وہ آگے بڑھیں گی۔

ندیم مسکرایا اور بولا

"ڈیم کا پانی ختم نہ ہو گا۔ میں یونہی ان کو ڈبو کر سب کو مار دوں گا۔ اور دوسروں کو

بھی ان سے نجات مل جائے گی۔"

"خدا کرے ایسا ہو۔"

نسرین نے مایوسی سے کہا۔ اور ندیم نے انجن دوبارہ چالو کر دیا۔ اب کے وہ خندق کو بھر رہا تھا۔

۷

رات ہو گئی تھی۔

چاندنی رات تھی۔ مگر پھر بھی انہوں نے پورا پورا انتظام کر رکھا تھا۔ انہوں نے دن ہی کو خندق کے چاروں جانب سرچ لائٹ نصب کر دی تھی۔ اور اس کی چکا چوند روشنی میں ہر چیز نمایاں دکھائی دیتی تھی۔ زمین خندق کے پانی سے گیلی ہو گئی تھی۔ ارد گرد گھاس تھی گو وہ بہت کم تھی مگر پھر بھی وہاں کیچڑ سا ہو گیا تھا۔ چیونٹیوں کا لشکر رُکا رہا جیسے وہ زمین سوکھنے کا انتظار کر رہا ہو۔ اس رات کوئی بھی

سو نہ رہا تھا۔ بچے تک جاگ رہے تھے۔

پہلے پہلے تو بچے دلچسپی سے اسے دیکھتے رہے تھے۔ مگر پھر وہ بھی خوف زدہ ہو گئے تھے۔ بڑوں کو خوفزدہ دیکھ کر وہ چیونٹیوں سے ڈرنے لگے تھے۔ ورنہ بچے چیونٹیوں سے ڈرا نہیں کرتے۔ جونہی زمین قدرے خشک ہوئی چیونٹیوں نے پھر اس جانب پیش قدمی شروع کر دی اور فارم پر دھاوا بول دیا۔ وہ بڑی تیزی سے بڑھ رہی تھیں۔ اب کے انہوں نے خشک خندق میں اترنا شروع کر دیا۔ جب خندق کی دونوں اطراف اور زمین پر چیونٹیوں کی چادر سی پھیل گئی جھٹ سے ندیم نے پمپ دوبارہ کھول دیا۔

پانی شور سے اور بڑی تیزی سے خندق میں گرنے لگا۔ جونہی پانی کا پہلا ریلا خندق میں آیا چونٹیاں تاڑ گئیں کہ خطرہ سر پر منڈلا رہا ہے۔ انہوں نے منہ سے منہ ملائے اور پھر لشکر رک گیا۔

مگر وہ تمام چیونٹیاں جو خندق میں گھس چکی تھیں پانی کی زد میں آ گئیں۔ انہوں نے لوٹ کر خندق سے باہر آنے کی کوشش کی مگر بہت کم چیونٹیاں اس میں کامیاب ہو سکیں۔

ہیوی پاور کا انجن بہت جلد خندق بھر دیتا تھا۔ چنانچہ خندق بھر گئی اور چیونٹیاں پھر سیاہ دھبّوں کی شکل میں اس کی سطح پر بکھر گئیں۔

یہ حالات فارم میں موجود لوگوں کے لیے امید کا پیغام تھے۔

نسرین نے کہا۔ ”ہم بہت دیر تک انہیں روک سکتے ہیں۔ اتنی دیر میں شاید کوئی مدد آجائے۔“

”مدد کہاں سے آئے گی؟“

مایوسی اور حیرانی سے ندیم نے کہا۔

”حکومت ضرور باخبر ہو گی۔ وہ ہماری مدد کرے گی۔ اور۔ دوسرے بہت سے فارموں والے بھی اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لیے کوشش کریں گے کیونکہ اگر ہم تباہ ہو گئے تو اس کے بعد ان کی باری ہو گی۔ اور اس کے بعد شاید یہ لشکر شہر کا رُخ کرے۔“ نسرین نے کہا۔

”حکومت پہلے ہی اپنی بے بسی کا اعلان کر چکی ہے۔ اب حکومت کیا امداد کر سکتی ہے۔“ ندیم نے جواب دیا۔

نسرین سوچوں میں گم رہی۔ ندیم نے پھر پوچھا۔

"تم کس فکر میں ہو؟"

"یہی کہ ہمیں یہاں سے فرار کی کوئی راہ اختیار کرنی چاہیئے۔" وہ بولی۔

"فرار۔۔۔۔"

وہ مذاق سے بولا۔

"کتنا احمقانہ خیال ہے۔ میں فارم چھوڑنے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔ یہ فارم میری زندگی ہے۔ اور میں اسے بچاؤں گا۔"

اور اگر اس فارم کو بچاتے بچاتے ہم سب کھیت رہے تو کیا ہو گا۔ اس صورت میں فارم ہمارے کس کام آئے گا۔" وہ بولی۔

"ہم زندہ رہیں گے۔۔۔۔" ندیم نے جواب دیا۔ "تم دیکھ لینا میں ان چیونٹوں کو تباہ کر کے دم لوں گا۔ میں ان چیونٹیوں کو آہستہ آہستہ ختم کر دوں گا۔ یہ بھی اس خندق کی بھینٹ چڑھ جائیں گی اور تم دیکھتی رہو گی۔۔۔۔"

"خدا کرے ایسا ہو۔۔۔۔" وہ بولی۔

اس نے پھر خندق کو خالی کرنا شروع کیا۔۔۔ پمپ خندق سے پانی کھینچ کھینچ کر دوبارہ چیونٹیوں پر ڈال رہا تھا۔ اور بے تحاشہ چیونٹیاں مر رہی تھیں۔ وہ اداس تھا۔ مگر عزم سے اس کا دل بھرا ہوا تھا۔

چیونٹیاں پھر رُک گئیں۔ اور وہ اپنے کام میں مصروف رہا۔ وہ بہت زور شور سے کام کر رہا تھا۔وہ اس مصیبت سے ہر حالت میں نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

چنانچہ یہی ہوتا رہا۔

وہ خندق بھرتا، چیونٹیاں پھر یلغار کرتیں۔ وہ دوبارہ خندق سے پانی کھینچ کر ان پر ڈالتا۔ اس طرح چیونٹیوں کی تعداد میں کمی ہوتی جاتی مگر وہ شاید مہینہ بھر تک بھی یہ عمل سر انجام دیتا رہتا تو چیونٹیاں کم نہ ہوتیں۔ وہ اب بھی بے حد تھیں۔ نو میل لمبا لشکر۔ وہ تو چند گز تک چیونٹیوں کو بھی ابھی ختم نہ کر پایا تھا اور پیچھے والی چیونٹیوں کو علم بھی نہ تھا کہ آگے کیا ہو رہا تھا۔

لطف کی بات یہ تھی کہ آگے والی چیونٹیاں سرداری کے فرائض سر انجام ر دیتی

تھیں۔ وہ فیصلے کرتی تھیں اور ان فیصلوں سے پچھلی چیونٹیوں کو آگاہ کرتی تھیں۔ مگر جب پانی پھینکنے کا عمل ہوتا یا جب خندق میں اترنا ہوتا تھا تو پہل یہی کرتی تھیں۔ اور ان کے بعد دوسری چیونٹیاں ان کے نقشِ قدم پر چل کر آگے آتی تھیں۔ اور جو سردار چیونٹیوں پر بیتتی تھی وہ ہی ان پر بیتتی تھی۔

مگر جب سردار چیونٹیاں مر جاتیں تو اس کے بعد والی چیونٹیاں خود سردار بن جاتیں تھیں۔ گویا پورے کا پورا لشکر سردار تھا اور وہ اٹل فیصلے کرتی تھیں۔

پانی گرانے، خندق میں بھرنے اور چیونٹیوں کو مارنے کے عمل سے فارم میں موجود ملازم مطمئن نہ تھے۔ ندیم بھی جانتا تھا۔ کہ وہ اس طرح مسلسل کرنے سے بھی ان چیونٹیوں کو تباہ نہ کر سکیں گے۔ جان کے بچاؤ کی ایک ہی صورت تھی اور وہ کوئی غیبی امداد تھی۔

اس دوران چند جہاز بھی اُدھر سے گزرے تھے۔ وہ بہت نیچی پرواز کر رہے تھے۔ جب جہاز آئے تو فارم میں موجود ملازمین اور ندیم کو حوصلہ ہوا۔ مگر وہ لوٹ گئے اور دوبارہ اُدھر نہ آئے چنانچہ انہیں مزید مایوسی ہوئی۔ انہوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ جہاز صرف تصاویر بنانے آئے تھے اور بنا کر چلے گئے۔ اور

تصاویر اگلے روز کے اخبارات میں لوگوں کی دلچسپی کا ساماں پیدا کرنے کے علاوہ اور کوئی فائدہ نہ دے سکتی تھیں۔ انھوں نے ندیم کے فارم اور خندق کی تصاویر بھی اتاری تھیں۔ کیونکہ یہ فارم اور خندق ان کے درمیان ایک دیوار بن گیا تھا۔ مگر وہ لوگ جہازوں کا زیادہ دیر انتظار بھی نہ کر سکتے تھے اور نہ انہیں یہ امید تھی کہ جہاز ان کی امداد کو آئیں گے۔

عملہ اور خود ندیم پوری طرح مستعد تھے۔ انھوں نے پورا دن چیونٹیوں کو روکنے کے لیے گزارا۔ غلّے کی بوریاں کھلے میدان میں رکھی تھیں۔ بار بار ندیم انہیں دیکھتا۔ اور اپنے قیمتی جانوروں کو بھی۔ اگر وہ چیونٹیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا تو اس کی سال بھر کی محنت کا صلہ یہ غلّہ اور جانور ان چیونٹیوں کی خوراک بن جاتے۔ اور یہ سے منظور نہ تھا۔ اس کی تباہی کے لیے اسی قدر کافی تھا۔

پورے دن میں انھوں نے دس بار خندق کو پانی سے بھرا اور خالی کیا۔ ارد گرد کے پورے علاقے میں پانی ہی پانی پھیل گیا تھا۔ مگر نہ جانے یہ چیونٹیاں کیا مصیبت تھیں کہ رکنے کا نام بھی نہ لیتی تھیں۔ اور آگے بڑھتی ہی چلی جارہی تھیں۔ وہ اس کیچڑ پر اس طرح تہہ در تہہ جم جاتیں کہ ان پر سے دوسری چیونٹیاں گزر

سکتی تھیں۔ ان میں سے ہر چیونٹی پچھلے والی چیونٹی کے لیے قربانی دینے کو تیار تھی۔

اور پھر۔ اچانک ایک حادثہ ہو گیا۔ جونہی ندیم نے دسویں بار خندق کو خالی کیا اور دوبارہ اسے بھرنے لگا۔ کھڑاک کی آواز پیدا ہوئی اور انجن ٹوٹ گیا۔ اس کا سر گھومنے لگا۔ موت سبھی کی آنکھوں تلے ناچ گئی۔ جلدی سے انہوں نے مستری سے کہا کہ وہ انجن جس قدر جلد درست ہو سکے کر دے۔ اور اس نے اپنی کوششیں شروع کر دیں مگر جلد ہی اس نے بتا دیا کہ وہ مجبور ہے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ انجن کا ایک ایسا اہم پرزہ ٹوٹ گیا ہے جو صرف شہر سے لا کر ڈالا جا سکتا ہے۔ اور اس پرزے کے بغیر انجن نہیں چل سکتا۔

سب کے چہرے اتر گئے۔ اور ان پر زردی چھا گئی۔ اتنی محنت اکارت گئی تھی۔

اور۔۔۔۔

ارے کچھ ہی دور چیونٹیاں خندق کے گرد نیا نیا گرایا گیا پانی قدرے خشک ہونے کا انتظار کر رہی تھیں۔

سورج ڈوبنے میں صرف آدھا گھنٹہ رہ گیا تھا۔ اور اس رات یہ نو میل لمبا چیونٹیوں کا عظیم لشکر ان کے لیے پیامِ موت ثابت ہو سکتا تھا۔

۸

یونس فارم کے ملازمین میں سب سے بزدل شخص تھا۔۔وہ گو موٹا تازہ، نوجوان اور خوبصورت شخص تھا مگر وہ دل کا بڑا بزدل تھا۔ سب سے زیادہ ان چیونٹیوں سے اسے ہی خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اور وہ ابتدا ہی سے بھاگنے کی تیاری کر رہا تھا۔

گو احمد جو ملازمین کا ہیڈ تھا وہ بھی کم بزدل نہ تھا۔ اور اس نے ندیم سے اس بارے میں جھگڑا بھی کیا تھا کہ وہ انہیں بھاگنے نہ دے کر اپنی موت کے منہ میں دھکیل رہا ہے۔ مگر وہ بھاگنے کا خطرہ مول نہ لے رہا تھا۔

مگر یونس اس کے بر عکس جب سے چیونٹیوں نے فارم پر دھاوا بولا تھا سبھی ملازمین سے سوائے بھاگنے کے امکانات اور طریقوں کے کسی اور مسئلے پر گفتگو نہ کر رہا تھا۔

اس کا میں چلتا تو وہ کبھی کا فرار ہو چکا ہوتا۔ مگر وہ اس قدر ڈرپوک تھا کہ وہ بھاگنے کا خطرہ بھی مول نہ لے رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ پہلے کوئی اور ملازم ان چیونٹیوں کے لشکر کو عبور کرے اور اگر کامیاب ہو جائے تو وہ بھی اسی طریقے پر عمل کرے۔ جب سے اس نے اس ہرن کا انجام دیکھا تھا جو ان چیونٹیوں کے چنگل میں پھنس چکا تھا اور وہ پل بھر میں اسے کھا گئی تھیں، وہ بھاگنے کے امکانات کو بھی انتہائی خوفناک خیال کر رہا تھا۔

جب تک خندق میں پانی بھر جاتا اور پھینکا جاتا رہا وہ مطمئن رہا اور اس نے بھاگنے کا ارادہ ملتوی کیے رکھا۔ مگر جونہی انجن ٹوٹا تو سبھی کو موت سروں میں ناچتی دکھائی دی۔ مگر چونٹیوں کی اس یلغار میں فارم کے مالک ندیم کا کوئی قصور نہ تھا۔ اس کے بچّے اور سب کچھ ہی تباہی کے دہانے پر تھا۔ اس لیے ملازم مالک سے اعتراض نہ کر سکتے تھے۔ قسمت پر سب چھوڑے بیٹھے تھے۔ جبکہ ندیم نے ان کو اجازت

دے رکھی تھی کہ ان میں سے جو بھی اپنا بچاؤ کر سکتا ہے کرے۔ وہ اسے روکے گا نہیں۔

انجن ٹوٹنے کے حادثے نے سبھی کو اداس اور نڈھال کر دیا۔ مگر یونس گویا پاگل سا ہو گیا۔ وہ ہذیان بکنے لگا۔ اس نے پہلے تو سبھی ملازمین کو بغاوت پر اکسایا مگر بغاوت سے کوئی فائدہ نہ تھا۔ اور یوں بھی باغی مالک سے کیا مطالبہ کرتے۔ مالک ندیم تو خود پھنسا ہوا تھا۔ جب اس کی باتوں کا دوسروں پر کوئی اثر نہ ہوا تو وہ سیدھا ندیم کے پاس آیا۔ اس نے غصّے اور پاگل پن میں ندیم کا گریبان پکڑ لیا۔

"ہمیں اس مصیبت میں مبتلا کرنے والے تم ہو۔" ندیم ملازم پر ہاتھ اٹھا کر دوسرے ملازمین کی ہمدردیاں کھونا نہ چاہتا تھا۔ اس نے یونس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور بولا۔

"تو تمہارا خیال ہے کہ چیونٹیوں کو اپنے فارم پر حملہ کرنے کی میں نے دعوت دی تھی۔۔ یہی بات ہے نا۔"

وہ ہکّا بکّا سا اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے بات بنائی۔

”تم ہمیں بھاگنے نہیں دیتے۔“

”میں نے کسی کو نہیں روکا۔“ ندیم نے غصّے سے کہا۔ اور پھر اس نے اعلان کیا۔ ”میں ایک بار پھر سبھی کے روبرو اعلان کرتا ہوں کہ آپ میں سے جو بھی یہاں سے فرار ہونا چاہے وہ ایسا کر سکتا ہے۔“

سبھی خاموش رہے۔ بھلا فرار کے امکانات موجود تھے؟ اور یوں بھی اگر فرار کے امکانات موجود ہوتے تو آدھے سے زیادہ ملازم بھاگ چکے ہوتے۔ یونس نے چلّا کر کہا۔

”میں ان چیونٹیوں میں سے نکل کر پناہ حاصل کر سکتا ہوں!“

”میں تمہیں روکوں گا نہیں۔ مگر مشورہ ضرور دوں گا کہ یہ خطرناک کھیل ہو گا۔ پھر بھی تم بضد ہو تو میں تمہیں اجازت دیتا ہوں۔“

ندیم نے کہا۔

”اگر تم یہ سب سچے دل سے کہہ رہے ہو تو مجھے ایک گھوڑا دے دو۔“ وہ بولا۔

ندیم کچھ سوچتا رہا۔ وہ گھوڑے کے بارے میں نہیں ملازم کے احمقانہ فیصلے اور اس کی زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ پھر وہ بولا۔

"تم گھوڑا بھی لے سکتے ہو۔ جو گھوڑا چاہو لے جاؤ۔"

بجلی کی سی پھرتی سے اس نے ایک گھوڑا لیا۔ اور اس کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ کر جونہی وہ جانے لگا احمد نے اس کا راستہ روک لیا اور بولا۔

"مت جاؤ میرے دوست۔ مت جاؤ۔ زندگی بہت قیمتی ہے۔ تم موت کے منہ میں جا رہے ہو۔"

"بے وقوف۔۔۔" یونس نے طنز سے کہا۔

"جب میں ان معمولی چیونٹیوں کے جال سے نکل جاؤں گا تو تم میری بہادری کی داد دو گے اور خود بھی میرے پیچھے آؤ گے۔"

مگر احمد راستہ روکے تھا۔ وہ بضد تھا کہ یونس رُک جائے مگر یونس نہ رکا۔ اس نے احمد کو دھکا دیا اور گھوڑا ایک چھلانگ لگا کر خندق عبور کر گیا اور چیونٹیوں کے لشکر میں گھس گیا۔ کچھ ہی دور جانے کے بعد نہ جانے کیا ہوا کہ گھوڑا بدکنے لگا۔ اور اس

نے چلنے سے انکار کر دیا۔ یونس نے ہر چند اسے چابک مارے آگے جانے کے جس قدر طریقے اسے یاد تھے اس نے آزما دیکھے مگر گھوڑا ٹس سے مس نہ ہوا۔

یونس نے چابک اٹھایا اور بے تحاشہ گھوڑے کو پیٹنا شروع کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس صورت میں گھوڑا ضرور آگے بڑھے گا۔ اور وہ بہر حال جدھر بھی چلا گیا کوئی پرواہ نہیں۔ ان چیونٹیوں سے تو جان بچے گی۔

مگر اس کا خیال درست ثابت نہ ہوا۔ گھوڑا بہت بدِکا اور اس نے پچھلی دونوں ٹانگیں اٹھا کر ایسا جھٹکا دیا کہ یونس نیچے آ رہا۔ وہ فارم سے پون میل دور تو ہو گا۔ اب بچاؤ کی صرف ایک صورت تھی اور وہ بھی فارم کی طرف واپس آنا۔ مگر اس کا وقت بھی گزر چکا تھا۔ آدم خور چیونٹیوں نے اس پر قبضہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ گھوڑے کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رہی تھیں۔ گھوڑا ہاتھ پاؤں چلاتا اِدھر اُدھر بھاگتا مگر وہ بے بس تھا۔ آہستہ آہستہ وہ چیونٹیوں سے سیاہ ہو رہا تھا۔

اور یہی حال یونس کا تھا۔ اس کے جسم پر بھی چیونٹیاں چڑھ رہی تھیں۔ وہ اس کے ناک، کانوں اور دیگر جگہوں میں گھستی رہیں۔ وہ زور سے چیختا ہوا فارم کی طرف بھاگتا رہا۔ بے بسی کی وہ مکمل تصویر دکھائی دیتا تھا۔ اس نے اپنا سارا لباس

تار تار کر دیا اور پھر جسم پر سے چیونٹیاں اتارنے میں بھاگنا بھی بھول چکا تھا۔

مگر وقت گزر چکا تھا۔ مادر زاد ننگا وہ بھاگتا رہا مگر فارم پون میل دور یعنی بہت ہی دور تھا اور اتنی دور تک چیونٹیاں اسے مہلت نہ دے سکتی تھیں۔ دو دن سے وہ بھوکی پیاسی ڈیرے ڈالے پڑی تھیں۔ اور اب جبکہ انہیں تازہ خوراک میسّر آئی تھی وہ اسے ہر حالت میں چٹ کر جانا چاہتی تھیں۔

آسمان پر دو پرندے چنگھاڑتے ہوئے اُڑ گئے۔ شاید وہ یونس کا نوحہ کر رہے ہوں۔ اور عین اسی لمحے وہ بے ہوش ہو کر گر گیا۔ ندیم اور فارم کے سبھی ملازم اسے دیکھ رہے تھے مگر کوئی بھی اس کی مدد نہ کر سکتا تھا۔ وہ بے بسی سے دیکھتے رہے اور چیونٹیوں نے اسے ڈھانپ لیا۔

صرف ایک گھنٹہ، ساٹھ منٹ کا مختصر گھنٹہ۔ اس کے بعد انہوں نے جو منظر دیکھا وہ دل ہلا دینے کے کافی تھا۔ جس مقام پر یونس گرا تھا اور چیونٹیوں نے اسے زیر کیا تھ،۔ جب وہ اس کا گوشت پوست کھا کر الگ ہو گئیں تو فارم والوں نے دیکھا وہاں صرف ہڈیوں اور چند بالوں کے گچھوں کا مجموعہ پڑا تھا۔ ابھی تک اسے چیونٹیاں نوچ رہی تھیں۔

یونس کی ہلاکت اس کے غلط فیصلے اور جلد بازی سے ہوئی تھی۔ اور یہی حال اس گھوڑے کا ہوا تھا جو فارم کے قریب ہی مردہ پڑا تھا۔ شاید اس کا گوشت زیادہ تھا اس لیے اسے کھانے میں بہت دیر لگی۔ رات ہو چکی تھی۔

انہوں نے سرچ لائٹ روشن کر دی اور اس کی روشنی میں چیونٹیوں کو دیکھنے لگے۔ زمین نسبتاً خشک ہو چکی تھی۔ یعنی اب اس حالت میں تھی کہ چیونٹیاں نقل و حرکت جاری رکھ سکیں۔ مگر یونس اور گھوڑے کے آ جانے کی وجہ سے لشکر نے فارم پار کرنے کی طرف توجّہ نہ دی۔ وہ ضیافت کھانے میں مصروف رہیں۔ شاید وہ اسے فارم والوں کا کوئی تحفہ خیال کر رہی ہوں۔

۹

جونہی ضیافت ختم ہوئی چیونٹیوں نے پھر فارم کی طرف توجہ دی۔ یہاں لشکر کا پیٹ بھرنے کا وسیع ذخیرہ موجود تھا۔

خندق خالی پڑی تھی اور پمپ ٹوٹا ہوا تھا۔ بے بسی سے سبھی ملازمین نے ندیم کو دیکھا اور پھر ایک نے پوچھا۔

"اب کیا ہو گا؟"

”مقابلہ جاری رہے گا۔“

ندیم نے جواب دیا۔

”تو کیا مقابلہ ہاتھوں سے ہو گا۔ پمپ ٹوٹ چکا ہے۔ اب خندق میں پانی بھرنے کا کیا طریقہ ہو گا۔“

وہ بولا۔

”ہمیں پائپ استعمال کرنا پڑے گا۔“ ندیم نے احمقانہ بات کہہ دی۔

”پائپ؟“ حیرانی سے وہ بولا۔

اور پھر ندیم کو خیال آ گیا کہ پائپ کو ڈیم تک پہنچانے کے لیے کسی ملازم کو ان چیونٹیوں کے لشکر میں سے جانا ہو گا اور شاید اس سمیت یہ رسک کوئی بھی نہ لے۔ یونس اور گھوڑے کا جو حشر ہو چکا تھا وہ کافی تھا کہ سب نصیحت لیتے۔ وہ سوچتا رہا اور پھر وہ چونک کر بولا۔

”ایک صورت ہے۔“

"کیا؟"

نسرین نے آگے جھک کر امید سے پوچھا۔

"ہم پانی کی بجائے پیٹرول بھریں گے۔ اور پیٹرول سے انہیں روکیں گے۔ جب تک انجینئر انجن درست کرے گا!" ندیم نے کہا۔

پھر وہ انجینئر سے مخاطب ہوا۔

"کیا انجن کا ٹوٹا ہوا پرزہ مرمت ہو سکے گا؟"

"کوشش کی جائے تو شاید ایسا ہو جائے۔ وقت بہت لگے گا۔" انجینئر نے بتایا۔

"تم اس پرزے کی مرمت کرو۔ تب تک ہم پیٹرول خندق میں بھر کر انہیں روکیں گے۔ پیٹرول انسانی جان سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔" ندیم جوش سے بولا۔
"میں ابھی سے کوشش شروع کر دیتا ہوں۔" انجینئر نے کہا۔

اور پھر وہ ایک اور ملازم کو ساتھ لے کر انجن پر جت گیا۔ سارے ملازمین اور خود ندیم امید کے عالم میں اسے انجن درست کرتے دیکھتے رہے اور خدا سے دعائیں مانگتے رہے کہ انجن درست ہو جائے۔

ایک دم سے ایک بچہ چلّایا۔

"ابو۔۔۔ابو۔۔۔وہ ادھر آرہی ہیں۔"

خوف سے بچے کی آواز گھٹی گھٹی سی تھی۔

ندیم نے دیکھا۔ چیونٹیوں نے خالی خندق عبور کر لی تھی۔ اور اب وہ دوسری جانب اتر رہی تھیں۔ان میں سے چند دوسری جانب اتر چکی تھیں۔

چلا کر ملازمین سے وہ بولا۔

"تم انہیں صاف کر کے واپس خندق میں گرادو۔ اور دو آدمی میرے ساتھ آؤ۔ ہم پیٹرول ٹینک سے خندق تک پٹرول لائیں گے۔" دو ملازمین اس کے ساتھ ہو گئے اور بقیہ بڑی تیزی سے جھاڑو سنبھالے چیونٹیوں کو پھر خندق میں گرانے لگے۔

وہ بے شمار تھیں۔ خندق میں وہ اس قدر اتر چکی تھیں کہ خندق کی تہہ اور دیواریں، سیاہ ہو گئی تھیں۔۔۔ اور ان کے خیال میں یہ کامیاب حملہ تھا۔ مگر ملازمین نے ہمّت نہ ہاری۔ بہت جلدی میں اور بجلی کی سی تیزی سے ندیم نے

پائپ کا سرا ٹھیک سے جوڑ دیا۔ وہ پائپ کا دوسرا سرا خندق تک لایا اور وہاں سے سرا کھول دیا۔ پانی کی جگہ پیٹرول خندق میں بھرنے لگا۔

وہ دیکھتا رہا۔ ایک دم سے اسے نہ جانے کیا خیال آیا اس نے ایک دوسرا پائپ لیا اور اس کا آخری سرا بھی خندق میں ڈال کر ایک سرا موبل آئل کے ٹینک سے جوڑ دیا۔ سفید پیٹرول اور سیاہ گاڑھا موبل آئل خندق میں گرتا رہا اور خندق کو بھرتا رہا۔۔

ایک ملازم نے پوچھا۔

ہمارے پاس کتنا پیٹرول ہے؟"

"بہت زیادہ۔"

تسلّی دینے کو ندیم نے جواب دیا۔

"کیا یہ سلسلہ جاری رہ سکے گا؟" وہ بولا۔

"ہم موبل آئل اور پیٹرول ملا کر ندی میں بھریں گے اور اس طرح کرنے کے لیے ہمارے پاس اتنا پیٹرول ہے کہ چار بار خندق کو بھرا جا سکتا ہے۔ چار بار یعنی

بارہ گھنٹے اور گزر سکتے ہیں۔" ندیم نے تسلی دی۔

"اس کے بعد کیا کریں گے؟ یہ تو اربوں کی تعداد میں ہیں۔"

"ہاں ہیں۔" ندیم نے جواب دیا۔ "آہستہ آہستہ سب ختم ہو جائیں گی۔ دیکھ لوں گا۔" وہ حقارت سے بولا اور ملازم کی باتوں کو صداقت کی کسوٹی پر پرکھتے رہے۔ واقعی انہوں نے یہ تو سوچا بھی نہ تھا کہ پیٹرول ختم ہونے کے بعد کیا ہو گا۔ بہر حال ایک پمپ کام کر رہا تھا۔ مگر وہ صرف پانی بھر سکتا تھا کھینچ نہیں سکتا تھا جبکہ دوسرا پمپ پانی بھر بھی سکتا تھا اور کھینچ بھی سکتا تھا۔

چیونٹیوں کا طریقہ کار اس نوعیت کا تھا کہ اگر خندق کو بھر دیا جاتا اور پھر اس میں سے پانی نہ کھینچا جاتا تو لازماً چیونٹیاں اسے عبور کر لیتیں۔ اور اس طرح فارم اور وہاں موجود انسان خطرے میں تھے۔

اور جہاں تک پیٹرول کا تعلق تھا وہ صرف دو چار بار اور بھرا جا سکتا تھا اور اس کے بعد ہر صورت میں انہیں پمپ درست کرنا تھا تاکہ پانی کو استعمال میں لایا جائے۔ پیٹرول اور موبل آئل تو مجبوری کے تحت استعمال کر رہے تھے۔ ملازم بے حد

مایوس تھا۔ وہ بولا۔

"پمپ درست ہو جائے گا۔" ندیم نے پھر اسے تسلّی دی۔

"اگر پمپ درست نہ ہوا تو؟" ملازم نے پھر سوال کر دیا۔

ندیم کو غصّہ آ گیا۔ وہ خود بے حد بور تھا اور یہ ملازمین اس کی پریشانی میں اضافہ کر رہے تھے۔ وہ غصّے سے چلّایا۔

"کہنا کیا چاہتے ہو؟"

ملازم ڈر گیا۔ وہ دبک کر بولا۔

"کچھ نہیں۔ میں تو یوں ہی پوچھ رہا تھا۔"

سبھی اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ انجینئر نے آگ جلائی اور ٹوٹا ہوا پرزہ کھول کر اس میں ڈال دیا۔ باقی سبھی ملازم اس کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ اس نے ہتھوڑے اور دیگر اوزار نکالے اور کوٹ کوٹ کر اس پرزے کی مرمت کی تدبیر کرنے لگا۔ وہ بڑے انہماک سے یہ کام کر رہے تھے کیونکہ ان کی بقا اسی میں تھی کہ وہ انجن درست کر لیں۔

دوسری جانب ندیم خندق بھر رہا تھا۔

موبل آئل اور پیٹرول نے خندق میں موجود چیونٹیاں تباہ کر دیں۔ پل بھر میں وہ سب کی سب تیل کی لپیٹ میں آ گیں اور مر گئیں۔ ان میں سے چند ایک کو خندق سے نکل جانے کا موقع ملا تھا۔ خندق بھرتی رہی اور لشکر رُکا رہا۔ اور پھر وہ وقت آیا جب خندق لبالب بھر گئی۔ چیونٹیوں کے راستہ روکنے کے لیے ندیم نے ایک اور اسکیم سوچی۔

اس نے ملازمین کی مدد سے فوّارے کی شکل میں پیٹرول اور موبل آئل ارد گرد چھڑک دیا اور چیونٹیوں کا راستہ روک دیا۔ وہ اور دور ہٹ گئیں اور فارم کے اِرد گرد پیٹرول اور موبل آئل بڑی مقدار میں پھیل گیا۔ سارا علاقہ موبل آئل اور پیٹرول کی بو میں بس گیا۔ اتنا قیمتی تیل آج تک کبھی بھی کسی شخص نے اتنی بے دردی سے استعمال نہ کیا ہو گا۔ مگر اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جان بچانے کے لیے ندیم کو ایسا کرنا ہی پڑا۔ وہ اسے بھی مہنگا سودا نہ سمجھ رہا تھا۔ اگر وہ اپنا سب کچھ لٹا کر بھی اس لشکر کو تباہ کر سکتا تو یہ گھاٹے کا سودا نہ تھا۔

چیونٹیاں رکی رہیں۔ فارم والوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ان میں سے ایک

نے کہا۔

"اب چیونٹیاں ادھر کا رخ نہ کریں گی۔"

مگر اسی لمحے سب چونک اٹھے۔

چیونٹیوں نے پھر پیش قدمی شروع کر دی تھی۔ گو وہ تیل اور موبل آئل سے گیلی زمین سے کچھ دور رکی ہوئی تھیں۔ مگر جونہی وقت گزرا وہ آگے بڑھیں۔ زمین پر تہہ در تہہ جمتی چلی گئیں۔ اور ان پر سے دوسری چیونٹیاں گزر کر خندق تک پہنچ گئیں۔

پہلے آنے والی چیونٹیوں نے خندق میں منہ ڈالا جیسے وہ تیل کو سونگھ رہی ہوں۔ کچھ دیر وہ رکیں۔ انہوں نے منہ سے منہ ملائے۔ آگے آنے والی چیونٹیوں نے پہلی اور بعد میں آنے والی چیونٹیوں نے اپنے بعد والی کو بتایا اور پل بھر میں یہ خبر سارے لشکر میں پھیل گئی کہ پیش قدمی شروع کر دی گئی ہے۔ یہ نئی مصیبت تھی۔

وہ خندق میں موجود تیل پر جمی چلی گئیں۔ اور چند منٹوں میں وہ تیل پر ایک تہہ

کی شکل میں جم گئیں۔ اب فارم تک پہنچنے کے لیے ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ اب وہ اپنی ساتھی چیونٹیوں پر سے گزر کر دوسری جانب جاسکتی تھیں۔ چند منٹ بعد وہ فارم تک پہنچنے والی تھیں۔

خوف سے سب سُن ہو گئے۔۔۔۔ یہ نیا اقدام حوصلہ شکن تھا۔ پمپ بھی ٹوٹا ہوا تھا اور وہ تیل کو نکال کر چیونٹیوں پر پھینک بھی نہ سکتے تھے۔ ساری تدابیر دھری کی دھری رہ گئیں۔ مگر ندیم مطمئن تھا۔ اس نے چلّا کر کہا۔

"دور ہٹ جاؤ میں تیل کو آگ لگاؤں گا۔"

"آگ!"

حیرانی سے نسرین نے کہا۔

"ہاں۔ اور کوئی صورت نہیں ہے۔"

ندیم نے جواب دیا۔

وہ خوفزدہ سی دیکھتی رہی۔ وہ پھر چلّایا۔

”بچّوں کو لے کر دور ہٹ جاؤ۔“

سب ملازم اور نسرین بچوں کو لے کر دور چلے گئے۔ ندیم کچھ دیر سوچتا رہا۔ اور جو نہی پہلی چیونٹی نے فارم میں قدم رکھا اس نے جیب سے اپنا سفید رومال نکالا اسے خندق میں موجود تیل میں ڈبویا اور پھر ماچس جلا کر اسے آگ لگا دی۔ سب حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ انجینئر اور اس کے ساتھی بھی یہ سب دیکھ رہے تھے۔ بجلی کی سی پھرتی سے ندیم نے وہ رومال خندق کے پار پھینک دیا جہاں زمین تیل سے گیلی ہو رہی تھی۔ بھک کی آواز آئی اور زمین پر فارم سے چاروں طرف آگ ہی آگ پھیلتی چلی گئی۔ چیونٹیوں کے لیے یہ نئی آفت تھی۔ ابھی تک تو بارش نہ ہوئی تھی۔ گویا قدرت نے بھی ان کا راستہ روکا تھا۔ مگر انسان ان کو روکنے کی نئی نئی ترکیبیں سوچ رہے تھے۔

آگ پھیلتی رہی اور چیونٹیاں پیچھے ہٹتی رہیں۔ بے شمار جل کر تباہ ہو گئیں۔ اور پھر خندق میں بھی آگ لگ گئی۔ آگ کا اتنا بڑا الاؤ روشن ہو گیا کہ فارم میں موجود لوگ بھی اس کی تپش سے متاثر ہوئے اور چیونٹیاں یوں دور رکی رہیں جیسے تماشہ دیکھ رہی ہوں۔ اور اپنی لاکھوں ساتھیوں کی تباہی کا انہوں نے کوئی اثر نہ لیا ہو۔

دس ہی منٹ میں کھیل ختم ہو گیا۔ پیٹرول اور موبل آئل کا سارا ذخیرہ جو خندق میں تھا جل گیا۔ مگر ابھی ارد گرد کی زمین اور خندق اتنی گرم تھی کہ چیونٹیاں اُدھر کا رُخ بھی کرتیں تو جل جاتیں۔

فارم میں موجود لوگوں کے چہرے خوشی سے تمتما رہے تھے اور چیونٹیاں دور خندق کے سرد ہونے کا انتظام کر رہی تھیں۔

۱۰

رات ڈھلتی رہی اور خندق سرد ہوتی رہی۔ وقت کی بات تھی کہ ان کے ذہن میں یہ عجیب و غریب ترکیب آ گئی۔ چیونٹیاں رکی رہیں جیسے ان کا اپنی جگہ سے ہلنا بھی جرم ہو۔ نہ جانے کیسی آواز تھی۔ شائد وہ ہل رہی تھیں۔ باقاعدگی سے سرسراہٹ کی آواز آتی رہی۔ یہ آواز غالباً ان کے چلنے کی تھی۔

اور پھر خندق کسی قدر سرد ہو گئی۔ ندیم کا خیال تھا کہ جب خندق بالکل سرد ہو جائے گی تو چیونٹیاں آگے بڑھیں گی۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ ابھی زمین اور خندق پوری

طرح سرد بھی نہ ہوئی تھی کہ انہوں نے پھر سرسرانا شروع کر دیا۔ انہوں نے منہ سے منہ ملائے، کچھ باتیں کیں اور آگے بڑھ گئیں۔ گرم زمین پر وہ یوں تہہ در تہہ بچھ رہی تھیں کہ حیرانی ہوتی تھی اور دیکھنے والا چونک اٹھتا تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی تھیں۔ آخر وہ جان دار مخلوق تھیں۔ اور ہر جاندار کو اپنی جان پیاری ہوتی ہے۔ پھر انہیں اپنی جان پیاری کیوں نہ تھی۔ مگر وہ تو اندھا دھند بڑھی چلی جا رہی تھیں اور کہیں رکتی نہ تھیں گرم زمین پر وہ ایک تہہ کی صورت میں بچھ گئیں۔ نہ تو پیچھے آنے والی چیونٹیوں نے بھی ان کی تقلید کی۔ وہ گرم سرنگ میں اترنے لگیں اور وہاں تہہ در تہہ جمنے لگیں۔

اب زمینی اتنی گرم بھی نہ تھی کہ وہ بھن کر رہ جاتیں یا گرمی کی وجہ سے زمین سے چمٹ جائیں۔ بہر حال وہ بڑھتی چلی گئیں اور سرنگ میں جمتی چلی گئیں۔ اور پھر اتنی موٹی تہہ کی صورت میں سرنگ میں جم گئیں اور دیواروں پر نہ جانے وہ کھڑی تھیں یا مری ہوئی لیٹی تھیں کہ ان پر سے دوسری چیونٹیاں گزر کر فارم پر حملہ کرنے والی تھیں۔ انہوں نے گویا پیچھے آنے والی چیونٹیوں کے لیے خود کو قالین کی صورت میں بچھا دیا تھا۔

پہلے تو وہ دلچسپی سے وہ اسے دیکھتے رہے۔ نسرین نے کہا۔

"اف اللہ۔۔۔۔ یہ جتنی تعداد میں مر رہی ہیں۔ اگر یہ ایسے ہی مرتی رہیں تو بہت جلد یہ سب کی سب ختم ہو جائیں گی ہے۔"

"یقیناً۔" ندیم نے جوش اور خوشی سے کہا۔

مگر قریب کھڑے ایک ملازم نے ان کا حوصلہ پست کر دیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"نو میل لمبا یہ جلوس اس طرح ختم نہیں ہو سکتا۔ آپ کس قدر چیونٹیوں کو مار دیں گے۔ ابھی تو چوتھائی فرلانگ بھی ختم نہیں ہوئی ہوں گی۔ سامنے دیکھو۔ حدِ نگاہ تک سیاہ زمین دکھائی دے رہی ہے۔ ندیم نے اچانک انجینئر سے پوچھا۔

"انجن کب تک درست ہو گا؟"

"ہم کام پر لگے ہوئے ہیں۔ انشاء اللہ یہ جلد درست ہو جائے گا۔" اس نے جواب دیا۔

اور واقعی کام امید افزا ہو رہا تھا۔ انہیں امید تھی کہ قسمت ساتھ دے گی اور انجن درست ہو جائے گا۔ اچانک نسرین نے چلّا کر کہا۔ "ندیم دیکھو وہ فارم میں

داخل ہونے والی ہیں۔“

اور واقعی وہ بڑی تعداد میں فارم کی طرف آنے والی خندق کی فصیل پر چڑھ رہی تھیں۔

ندیم مسکرایا-اس حالت میں اس کا مسکرانا زندہ دلی کی دلیل تھا۔ اس نے کہا۔

”میں ابھی ان کی خبر لیتا ہوں۔“

اور پھر اس نے پائپوں کے منہ کھول دیے۔ تیزی سے پیٹرول خندق میں گرنے لگا اور وہ خندق کو بھرتا رہا۔ چند ہی منٹوں میں وہ سب تیل کی زد میں آ گئیں۔ خندق کی دیواروں پر پائپوں سے تیل گراتے اور انہیں صاف کر کے خندق کی تہہ میں پھینک دیتے۔

وہ بڑی تعدار میں مرتی رہیں اور خندق کی تہہ میں جمع ہوتی رہیں۔

انہوں نے پہلے والا عمل دوبارہ دھرایا اور خندق کے ارد گرد بھی پیٹرول اور موبل آئل چھڑک دیا۔ وہ وہاں بھی مریں اور بڑی تعداد میں تباہ ہو گئیں۔

لشکر پھر پیچھے ہٹا اور رک گیا۔ گویا یہ ننھے ننھے کیڑے بھی اپنے ساتھیوں کی تباہی

کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ اس بار انہوں نے خندق کے پار پائپ سے زیادہ تیل گرایا اور دور دور تک انہیں تباہ کیا۔ وہ مرتی رہیں مگر ان کے عزم میں فرق نہ آیا۔ وہ بڑی سخت جان تھیں اور ساتھیوں کے مرنے کی پروانہ کر رہی تھیں۔ اب وہ پہلے سے بھی تیز ہو گئی تھیں۔ دوسرا دن تھا کہ وہ خندق کے کنارے رکی پڑی تھیں۔ اور ان حالات میں وہ بھوک سے بھی یقیناً بے تاب تھیں۔ ایک ہر، ایک گھوڑا اور ایک انسان کو کھا کر ان کا پیٹ نہ بھرا تھا۔

آپ پڑھ کر حیران ہوں گے کہ چیونٹی کا پیٹ تو بہت ہی کم غذا سے بھر جاتا ہے آخر وہ ہوتا ہی کتنا ہے مگر جہاں نو میل میں چیونٹیاں ہی چیونٹیاں ہوں وہاں ہزاروں من غلّہ اور خوراک بھی کم پڑ جاتی ہے۔

وہ بھوک سے بے تاب تھیں مگر ندیم نے ان کو روکا ہوا تھا۔ ان کا جدوجہد کے سامنے کوئی بس نہ چلتا تھا اور ارد گرد کا علاقہ بھی تیل سے بھر گیا تھا۔

اس بار چیونٹیوں نے تیل کے زمین میں جذب ہونے اور راستے کے صاف ہونے کی پرواہ نہ کی۔ وہ خوف زدہ کر دینا چاہتی تھیں۔ ان کی سردار جو ہر بار مرتی تھیں اور پھر لشکر سے نئی نکل کر ان کے سردار کے فرائض سنبھال لیتی تھیں بے

دھڑک مرتی تھیں۔

اس بار انہوں نے منہ سے منہ ملائے اور ان چیونٹیوں کو آگے بڑھنے کا مشورہ دیا۔ وہ مجھے بڑھیں اور بڑھتی چلی گئیں۔ اور تیل پر جم گئیں۔

اور پھر انہوں نے آگے بڑھ کر خندق میں تیل پر تیرنا اور جمنا شروع کر دیا۔ اس بار اتنی تیزی سے اور جلدی سے کام کر رہیں تھیں جیسے وہ جارحانہ انداز میں آگے بڑھ رہی تھیں اور خود کو تباہ کرنے سے بھی نہ چوک رہی ہوں۔ تمام ملازمین اور ندیم نے ان کا یہ عزم دیکھا مگر موت اب کے بھی ان کا مقدر ہو چکی تھی۔ ندیم نے پہلی بار کی مانند اس بار بھی تیلی جلائی۔ ایک کپڑا جسے تیل میں بھگو کر وہ لیے کھڑا تھا جلایا اور خندق کے پار پھینک دیا۔ اندھیرے میں جیسے دن چڑھ آیا ہو۔ چکا چوند کر دینے والی روشنی میں انہوں نے چیونٹوں کو ابلتے دیکھا۔ وہ دور دور ہٹ گئے اور خندق کا تیل ایک بڑے آلاؤ کی صورت جلنے لگا۔

دس بارہ منٹ میں سارا تیل جل گیا اور زمین گرم ہو کر گویا سرخ ہو گئی۔

چیونٹیاں اب بھی رُکی ہوئی تھیں اور اپنی مرنے والی ساتھیوں کا انجام دیکھ رہی

تھیں۔ ان کا لشکر دور رکا کھڑا تھا۔ ندیم نے نسرین سے کہا۔

"اس جانور کا عزم قابلِ دید ہے۔ وہ یوں رکی کھڑی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں یہ ہماری ضد کا سوال ہے کہ ہم خندق پار کر کے اپنی مرنے والی ساتھیوں کا بدلہ لیں اور یہ تمہارا کام ہے کہ تم ہمارا راستہ روکو۔"

وہ سوچتا رہا اور اپنے بچّے کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

اچانک اس کے ایک ملازم نے کہا۔ "اس لشکر کی آخری چیونٹی بھی ہمارے خلاف لڑتی رہے گی اور جان دے دے گی۔ شاید انہوں نے پیچھے نہ ہٹنے کی قسم کھار کھی ہے۔"

اتنے میں چند جہاز بھی ادھر آئے تھے۔ مگر رات کے اندھیرے میں وہ صرف چکر کاٹ کر چلے گئے۔ شاید کسی دوسرے فارم والے نے ان کی حکومت کو فارم میں آگ لگنے کی اطلاع دی تھی۔ اور جہاز آگ کو سرد پا کر واپس چلے گئے تھے۔ دوسرے فارم والا کوئی بھی شخص اس مصیبت سے واقف نہ تھا جو ندیم اور ان لوگوں پر ٹوٹ پڑی تھی۔

۱۱

رات گزرتی رہی اور چیونٹیوں کی فارم والوں سے جنگ جاری رہی۔ تین بار خندق میں تیل بھر کر اور پھر جلا دینے کے بعد بھی چیونٹیوں کی یلغار نہ رُکی تھی اور ان کی پیش قدمی میں فرق نہ آیا تھا۔ آخری بار جب اس نے خندق میں پیٹرول بھر کر اسے جلایا اور چیونٹیوں کو روکا تھا اس کا خیال تھا کہ جو جہاز صورتِ حال کا جائزہ لے کر گئے ہیں وہ ضرور واپس آئیں گے۔ مگر جہازوں کو گئے بہت دیر ہو چکی تھی۔

زمین پھر سرد ہو گئی۔ یہ رات کا آخری پہر تھا اور صبح ہونے میں چند گھنٹے باقی تھے۔ فارم کے ملازم اور خود ندیم سو گیا۔ بچے اور نسرین بھی کئی دنوں کی شب بیداری کے بعد سو گئے تھے۔

چیونٹیوں نے سورج طلوع ہونے سے کچھ دیر پہلے ہی یلغار کر دی اور وہ فارم کی جانب بڑی تیزی سے بڑھنے لگیں تھیں۔ انہوں نے حسبِ سابق پھر خندق میں اترنا شروع کر دیا۔ پانی تو تھا نہیں اور خندق بھی اب معمولی سی گرم رہ گئی تھی۔ اس لیے انہیں زیادہ دشواری پیش نہ آ رہی تھی۔ گو سبھی سو گئے تھے مگر فارم انجینئر اور کچھ اور ملازم تاحال جاگ رہے تھے۔

جونہی پہلی چیونٹی نے ندیم کی زمین پر قدم رکھا وہ چلّانے لگے۔ انہوں نے فوراً ندیم کو اس خطرے سے آگاہ کیا۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور ملازم کی جانب دوڑ پڑا۔ اس نے پھر پائپ کا منہ کھول دیا اور پیٹرول بھر خندق میں بھرنے لگا۔۔۔ چیونٹیاں پہلے کی طرح پیٹرول میں دھبّے بن کر بہہ گئیں اور ندیم غور سے انہیں دیکھتا رہا۔ خندق میں پیٹرول بھرتا رہا۔ ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ پیٹرول ختم ہو چکا تھا۔ ابھی خندق آدھی

بھری تھی مگر پائپ میں سے پٹرول قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔ حیرانی سے وہ بڑے ٹینکر کی طرف گیا مگر ہاں بھی پیٹرول موجود نہ تھا۔

خندق میں ناپ کر پیٹرول تو بھرا نہ جاتا تھا۔ اور اس اندھا دھند پیٹرول کے خرچے کا انہیں اندازہ نہ رہا تھا چنانچہ بے خیالی میں وہ بہت پیٹرول خرچ کر چکے تھے۔ جب ندیم واپس لوٹا تو اس کے پاؤں نہ اٹھ رہے تھے۔ مایوسی سے گویا جسم کانپ رہا تھا۔

نسرین بچے کو گود میں لیے آگئی۔ اس نے کہا۔

"کیا بات ہے آپ کی طبیعت تو درست ہے نا؟"

"ہاں۔۔۔" وہ مایوسی سے بولا۔ "یوں معلوم ہوتا ہے جیسے چیونٹیاں جیت جائیں گی۔"

"نہیں۔۔۔۔" وہ سختی سے بولی۔ "ہماری اتنی محنت اور اتنا نقصان ضرور رنگ لائے گا۔"

"مگر۔۔۔ مگر پیٹرول ختم ہو چکا اور اب چیونٹیوں کو روکنا انسانی طاقت سے باہر

ہے۔" اس نے جواب دیا۔

نسرین کے چہرے میں بھی مردنی چھا گئی۔ مگر اتنی دیر میں انجینئر انجن درست کر چکا تھا۔ وہ ان کے قریب آیا اور بولا۔

"مبارک ہو۔۔۔۔"

"مبارک کیسی؟"

حیرانگی سے وہ دونوں بولے۔

"انجن درست ہو گیا ہے۔" انجینئر نے خوشی سے جواب دیا۔

اور ایک دم سے یوں ان کے چہروں پر رونق دوڑ گئی جیسے ان کی گمشدہ جنّت انہیں مل گئی ہو۔ ندیم نے جوش سے کہا۔ "میں چیونٹیوں کو ایک قدم بھی نہ بڑھنے دوں گا۔"

مگر چیونٹیوں کی پیشوائی پھر شروع ہو چکی تھی۔ وہ رکنے والی کہاں تھیں۔ انہوں نے پھر پڑھنا شروع کر دیا تھا اور وہ تیل کے اوپر تہہ کی صورت میں جم رہی تھیں۔

فتح مندی کے احساس کے ساتھ ندیم نے ان مرتی ہوئی چیونٹیوں کو دیکھا اور پھر سامنے پھیلے ہوئے اس وسیع و عریض لشکر کو دیکھ کر وہ بولا۔

”موت ان سب کا مقدر ہو چکی ہے۔“

اور واقعی انجن کی مرمت کے بعد یہ بات صاف دکھائی رہی تھی۔ وہ لوگ چیونٹیوں کو روک سکتے تھے۔ اور ان کے سیلاب کے سامنے دیوار بن سکتے تھے۔

تیل پر چیونٹیوں کی تہہ جم گئی۔ بے شمار چیونٹیاں مرتی تھیں اور پھر ایک دم سے جلتا ہوا ایک کپڑا ندیم نے خندق میں پھینک دیا۔ اس بار وہ خندق کے گرداگرد تیل نہ چھڑک سکا تھا کیونکہ خندق بھرنے سے قبل ہی تیل ختم ہو چکا تھا۔

آگ روشن ہو گئی۔

چیونٹیوں کا لشکر پھر رُک گیا مگر اس بار وہ اتنی دور نہ گئیں تھیں۔ اس بار وہ خندق سے زیادہ قریب تھیں۔ آگ میں بے شمار چیونٹیاں مر گئیں اور تباہ ہو گئیں۔

اوور خندق بے حد گرم ہو گئی۔

وہ دور دور ہٹ گئیں تھیں۔ اور رکی کھڑی تھیں۔

ندیم نے نسرین سے کہا۔ ”اب ہم اس میں پانی بھریں گے۔“

”ہاں۔“

وہ عزم سے بولی۔ ”اگر انجن جلد درست ہو جاتا تو ہم پیٹرول کے نقصان سے بچ جاتے۔“

”مجھے اس نقصان پر افسوس نہیں۔ پیٹرول ہم سب کی زندگی سے زیادہ قیمتی چیز تو نہ تھی۔“ وہ بولا اور نسرین مسکرا دی۔

اچانک اسے کوئی خیال آ گیا۔ وہ انجینئر سے بولا۔ ”انجن چالو کر دو۔ ہم ان چیونٹیوں پر پائپ سے پانی گرائیں گے۔“

”ہاں ہاں یہ ٹھیک ہے۔“ ایک ملازم نے یوں کہا جیسے یہ اس کے دل کی بات ہو۔“

انجن چالو کر دیا گیا۔

انجن چلا۔ اس نے تھوڑا سا پانی کھینچا۔ اور پھر ایک زور دار آواز کے ساتھ اس کا وہی پرزہ پھر ٹوٹ گیا جو اس سے قبل ٹوٹا تھا۔ اس بار انجن اتنا زیادہ خراب ہو گیا

تھا کہ اسے درست کرنا بھی مشکل تھا۔ سبھی کے رنگ فق ہو گئے اور موت کی زردی ان کے چہروں پر پھیل گئی۔

ندیم نے کہا۔ "ایک آخری سہارا بھی ختم ہوا۔"

"اب کیا ہو گا؟" نسرین نے کانپتی آواز میں پوچھا۔

جواب دینے کی بجائے ندیم انجینئر سے مخاطب تھا۔ اس نے پوچھا۔

"انجن دوبارہ درست ہو سکے گا؟"

"میں دیکھتا ہوں۔" وہ بولا۔

پھر اس نے انجن کا معائنہ کیا اور بولا۔

"اب انجن درست نہ ہو سکے گا اور کوشش بھی کی گئی تو اس میں ایک دن تو ضرور لگے گا۔"

"اور اس ایک دن میں ہم ان چیونٹیوں کی خوراک بن جائیں گے۔"

"ہاں۔۔۔" انجینئر نے جواب دیا۔

"مگر اب انجن جلد درست کرنا میرے بس میں نہیں۔ اور میرا خیال ہے اب کے یہ اتنا خراب ہو گیا جو کہ مرمّت کرنے کے لیے اسے شہر لے جانے کی ضرورت ہے۔"

ندیم مایوسی کے عالم میں کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔

"ہمیں ہمّت نہیں ہارنی چاہیے۔ ہمیں بہر حال کچھ نہ کچھ ضرور کرنا ہو گا۔ اسی میں ہم سب کی بقا ہے۔"

"مگر ہمّت کیا کرے گی۔ یہ چیونٹیاں انسانی بس سے باہر ہیں۔ حکومت بھی انہیں روکنے میں ناکام رہی ہے۔" انجینئر نے بتایا۔

"ہمیں کسی نہ کسی طرح اس فارم سے نکلنا ہو گا۔ گھوڑے ہمارے پاس ہیں اور پچھلی طرف سے اگر جایا جائے تو دوسرے فارم چند میل دور رہ جاتے ہیں۔" ایک اور ملازم نے بتایا۔

"ہاں یہ بھی ممکن ہے۔" ندیم نے اس کی ہاں سے ہاں ملائی۔ "مگر گھوڑے پر بھاگنے کا نتیجہ آپ سب نے دیکھ لیا ہے۔ ہمارا ایک آدمی ضائع ہو چکا ہے۔ ممکن

ہے اس ترکیب سے چند نفوس بچ جائیں مگر زیادہ تر مارے جائیں گے۔" انجینئر نے کہا۔

"پھر اس کے علاوہ کیا چارہ کار ہے۔ یہاں رینگ رینگ کر اور سسک کر اس ادنیٰ سی مخلوق کے ہاتھوں مرنا اور ان کی خوراک بن جانا بھی تو بزدلی ہو گی۔" ندیم نے جواب دیا۔

"کیوں ناوہ تمام غلّہ جو یہاں موجود ہے پچھلے راستے پر پھیلا دیا جائے۔ میرا خیال ہے اس صورت میں چیونٹیوں کا سارے کا سارا لشکر ادھر ہی کا رخ کرے گا اور یہ سامنے والا راستہ صاف پا کر ہم بھاگ جائیں گے۔" انجینئر نے ہی مشورہ دیا۔

"یہ بھی فضول ہے۔ تم نے دیکھا کہ جس حصّے میں خوراک ہوتی ہے صرف وہیں کی چیونٹیاں حرکت کرتی ہیں باقی چیونٹیاں تو اپنی جگہ سے ہلتی بھی نہیں ہیں۔ اس صورت میں تو غلّہ بھی وہ کھا جائیں گی اور کچھ فائدہ بھی حاصل نہ ہو گا۔"

ندیم نے اس تجویز سے بھی اتفاق نہ کیا۔

وہ سب کسی اور ترکیب کے بارے میں سوچتے رہے۔ پھر مایوسی کے عالم میں

انجینئر ہی نے کہا۔ بس اب تو ڈیم کی جانب سے بھاگ جانے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔ ڈیم یہاں سے ڈیڑھ میل ہو گا۔ اور وہاں پانی کے کنارے تک چیونٹیاں ہو سکتی ہیں۔ اس سے آگے نہیں۔ اس صورت میں یہ ڈیڑھ میل کا فاصلہ طے کر کے اور پھر ڈیم میں تیر کر اسے عبور کر سکتے اور جانیں بچا سکتے ہیں۔" انجینئر ہی نے مشورہ دیا۔

اچانک ندیم کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ وہ چلّا کر بولا۔

"ہم سب محفوظ رہیں گے۔ میں نے ایک ترکیب سوچ لی ہے۔"

"وہ کیا ہے؟" نسرین نے آگے کو جھک کر پوچھا۔

مگر ندیم اس جانب متوجہ نہ ہوا۔ اس نے کہا۔

"سبھی آدمیوں کو جمع کرو۔ میں ان سب سے مشورہ کروں گا۔

پل بھر میں سبھی آدمی جمع ہو گئے اور ندیم کا مشورہ سننے کے لیے بے تاب دکھائی دینے لگے۔

۱۲

اچانک ندیم نے کہا۔

”دوستو اور ساتھیو۔ اس وقت ہم سب کی جان سخت خطرے میں ہے۔ اگر فوری اقدام نہ کیا گیا تو آنے والے چند گھنٹے ہمارے لئے موت کا پیغام لائیں گے۔ ہم سب کی بچت اسی میں ہے کہ ہم ان چیونٹیوں کے میلوں لمبے جلوس کو تباہ کر دیں۔۔۔۔۔۔ اور میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم میں سے کسی ایک کو اپنی جان خطرے میں ڈالنی ہو گئی۔ ہم سب کی بقا کے لیے کسی کو اپنی جان کی قربانی دینی ہو

گی۔“

سبھی خاموش رہے۔ پھر ایک شخص جو نوجوان بھی تھا اور جرأت مند بھی اور چیونٹیوں کو روکنے کے لیے اس نے دوسرے آدمیوں سے زیادہ محنت کی تھی آگے بڑھا اور اس نے کہا۔

”میں آپ سب کے لیے اپنی جان کی قربانی دوں گا۔“

ندیم نے پیار سے اسے دیکھا اور پھر کچھ سوچتا رہا۔ آہستہ سے اس نے نوجوان کی پیٹھ پر تھپکی دی اور بولا۔ ”نہیں۔ تم قربانی نہیں دو گے۔“ ”پھر کون ہو گا جو قربانی دے گا؟“ نسرین عجیب نظروں سے ندیم کو دیکھ رہی تھی جیسے اس کے شوہر کا دماغ خراب ہو گیا ہو۔

ندیم نے کہا۔ ”آپ سب کے لیے میں قربانی دوں گا۔“

نسرین سکتے میں آگئی۔ پھر وہ چلّائی۔

”نہیں نہیں نہیں سر تاج۔ تم نہیں مرو گے۔ میں قربانی دوں گی۔“

وہ رونے لگی۔ ندیم نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور پیار سے بولا۔ ”خود پر قابو رکھو

نسرین۔ خدا سب درست کرے گا۔ تم عورت ہو۔ تم کچھ نہ کر سکو گی۔"

مگر وہ روتی رہی۔ یہ وقت ضائع کرنے کا نہ تھا۔ تمام ملازمین عقیدت سے سر جھکائے ندیم کے سامنے کھڑے تھے۔ ندیم نے اپنا منصوبہ بتانا شروع کیا۔ اس نے کہا۔

"انجینئر صاحب کے ڈیم کے بارے میں اور فاصلے کے متعلق بتانے پر میں نے سوچا کہ ڈیرھ میل دور اگر جایا جا سکے تو ہم بند کا وہ دروازہ کھولیں جو اس سمت پانی لاتا ہے۔ وہ مشین کے زور سے بند رہتا ہے۔ اگر اسے پورے کا پورا کھول دیا جائے تو بند کا پانی اس علاقے میں تیزی سے پھیل جائے گا اور بیس پچیس میل کے علاقے میں سیلاب پھیل جائے گا اور اس علاقے میں چھ، چھ، سات، سات فٹ پانی کھڑا ہو جائے گا۔ گو ہمارا فارم اس سے سب سے زیادہ متاثر ہو گا مگر ہم احتیاطی اقدامات کر کے خود کو بچا سکیں گے۔ ہمیں تمام اناج اور دوسری ضروری اشیاء عمارتوں کی چھتوں پر لے جانی ہوں گی اور خود بھی چھتوں پر چڑھ جانا ہو گا۔ رہا مویشیوں اور گھوڑوں کا مسئلہ تو انہیں بھی آسانی سے اونچے مقام تک لے جایا جا سکتا ہے۔ وہاں گو سیلاب کا پانی آئے گا مگر ایک آدھ فٹ سے زیادہ نہیں۔ ہم

انہیں بچا سکیں گے۔ اور رہا بند کو توڑنے یا کھولنے کا معاملہ تو یہ خدمت میں انجام دوں گا۔ اگر میں بچ رہا تو میں آپ لوگوں سے آملوں گا۔ اگر میں نہ بچ سکا تو میرے بیوی بچوں کی حفاظت آپکی ذمہ داری ہو گی۔"

سبھی ملازم دم سادھے کھڑے تھے اور نسرین شوہر کے سینے سے لگ کر رو رہی تھی۔ اسے دوسروں کی موجودگی کی پروانہ تھی۔

ندیم نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ "اب آپ لوگ جلد سے جلد اناج اور دوسری اشیاء چھتوں پر لے جائیں اور خود بھی چلے جائیں۔ وقت کم ہے۔ چیونٹیاں فارم پر یلغار کرنے ہی والی ہیں۔"

جلدی جلدی سبھی نے غلّہ اور اشیاء چھتوں پر لے جانی شروع کر دیں۔ ہر کوئی مشینی انداز میں کام کر رہا تھا۔ اور خود ندیم بھی ان ان کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ نسرین اور بچّے رو رہے تھے اور ملازمین ندیم کے ایثار سے اس کے ہر حکم پر جان بھی نچھاور کر دینے کو تیار تھے۔

انہوں نے غلّہ، اشیاء اور مویشیوں کو محفوظ مقامات تک پہنچا دیا۔ اور اسی لمحے

انہوں نے دیکھا چیونٹیوں کا ایک ہر اول دستہ فارم میں داخل ہو چکا تھا اور باقی چیونٹیاں تیزی سے فارم میں داخل ہو رہی تھیں۔ چونٹیاں جیت گئی تھیں۔ یہ الگ بات تھی انہیں اس جیت کے لیے اپنی لاکھوں ساتھیوں کی جان کی قربانی دینی پڑی تھی۔

سبھی ندیم کے اگلے اقدام کے بارے میں سوچ رہے تھے اور ندیم جو خطرے میں جارہا تھا آخری بار اپنے بیوی بچوں سے مل رہا تھا۔ اس نے نسرین سے کہا۔

"انسانیت کا پہلا درس یہی ہے نسرین کہ دوسروں کے کام آؤ اور ان کے لیے اپنی جان قربان کر دو۔ کل میرے بچّے اور خود تم میرے اس اقدام پر فخر کیا کرو گی۔ تم بچّوں کی حفاظت کرنا۔ مگر میرا دل کہتا ہے کہ میں بچ جاؤں گا اور تم لوگوں سے آن ملوں گا۔ دل چھوٹا نہ کرو۔ خدا سب درست کرے گا۔ اب تم چھت پر جاؤ۔"

سبھی ملازمین چھت پر جا چکے تھے۔ احمد ندیم کے ساتھ تھا۔ اس نے کہا۔ "چیونٹیاں فارم میں تیزی سے داخل ہو رہی تھیں۔"

”پرواہ نہ کرو۔ یہ ان کا آخری وقت ہے۔“ندیم نے جواب دیا۔

پھر تیزی سے اس نے اپنے پاؤں بدن اور ٹانگوں کے گرد بہت موٹے موٹے کپڑے باندھے۔ انہیں تیل سے تر کیا اور ماچس جیب میں ڈال کر گھوڑے پر سوار ہوا۔ اور ساتھیوں سے ہاتھ ملا کر آخری بار خدا حافظ کہہ کر خندق پار کر کے چیونٹیوں کے لشکر میں گھس گیا۔ اس کا رُخ ڈیم کی جانب تھا۔

۱۳

افسوس اور خوشی کے ملے جلے جذبات سے سبھی ندیم کو دیکھ رہے تھے جس کا گھوڑا تیزی سے ڈیم کی جانب رواں دواں تھا۔ سبھی دل سے اس کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگ رہے تھے۔ نسرین رو رو کر اس کے لیے دعا کر رہی تھی۔

وہ بڑھتا رہا اور ڈیم کی جانب تیزی سے رواں رواں رہا۔ مگر چیونٹیوں کو بھی شاید ان کے خون کی بُو آ گئی تھی۔ خوراک کو پا کر وہ بے تاب ہو گئیں اور انہوں نے گھوڑے پر یلغار کر دی۔

وہ بھاگتے ہوئے گھوڑے کے پاؤں پر اتنی تیزی سے چمٹی تھیں کہ حیرت ہوتی تھی۔ گھوڑے کو اس بات کا علم ہو چکا تھا اور وہ بِدک رہا تھا۔ فارم والے اسے دیکھ رہے تھے کہ ندیم کو گھوڑے کو سنبھالنے کے سلسلے میں دشواری ہو رہی تھی۔ اور پھر چیونٹیاں اس کے جسم تک پہنچ گئیں اور گھوڑے کے کانوں میں گھسنے لگیں۔

یہ وہ موقع تھا جب ندیم ڈیم سے تین فرلانگ دور رہ گیا تھا اس نے جیب سے ماچس لی اور جلا کر گھوڑے کی ٹانگوں پر تیل میں بھیگے ہوئے کپڑوں کو آگ لگا دی۔

آگ کا الاؤ روشن ہو گیا۔ مگر گھوڑا اس اقدام سے مزید بِدکا اور وہ اتنے زور زور سے ہلنے لگا کہ ندیم گھوڑے پر سے گِر گیا۔ نسرین نے چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئی۔

فارم پر موجود لوگوں نے اسے سنبھالا اور ہوش میں لائے۔

احمد نے کہا۔ ”میں ندیم کی مدد کو جاؤں گا۔“ مگر انجینئر نے اسے روک دیا۔

”کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ تم بھی جان گنوا دو گے۔“

اور پھر وہ چونک اٹھے۔ ندیم سرپٹ ڈیم کی جانب بھاگ رہا تھا۔ گھوڑا بھی ڈیم کی جانب بھاگا تھا اور ندیم سے بہت پہلے اس نے ڈیم کے پانی میں چھلانگ لگادی تھی اور اتنے گہرے پانی میں ڈوب گیا تھا۔

ندیم بھاگتا رہا۔ آگے بڑھتا رہا اور چیونٹیاں اس پر یلغار کرتی رہیں۔ اور فارم والوں کے یہ دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ اس کے سارے جسم پر چیونٹیاں چمٹ گئی تھیں اور جسم سیاہ ہو رہا تھا۔ اور پھر چیونٹیوں کے کاٹنے اور اتنی زیادہ چیونٹیوں کے چمٹ جانے کے باعث وہ بے چین ہو گیا۔

ڈیم نصف فرلانگ رہ گیا تھا۔

ندیم نے ماچس نکالی اور اپنے جسم پر بندھے ہوئے کپڑوں میں آگ لگا دی۔ چیونٹیاں جل گئیں۔ اور جسم پر رینگنے والی چیونٹیوں کو وہ مسلنے لگا۔ کپڑوں کے اندر چیونٹیاں ہی چیونٹیاں تھیں۔ اس نے تمام کو مسل دیا۔ مگر ابھی کہاں ختم ہو تیں تھیں۔ وہ سرپٹ بھاگتا رہا۔ اسے تکلیف اور تپش کا احساس تھا۔ صرف ایک دھن تھی، ڈیم تک جانا تاکہ چیونٹیاں تباہ ہو جائیں۔ اور اس کے بیوی بچّوں کے علاوہ ساتھیوں کی جان بچ جائے۔ اور وہ ثابت کر سکے کہ انسان سب سے

عقلمند ہے اور مصیبتوں سے نہیں گھبراتا۔

جب وہ ڈیم تک پہنچا تو گویا وہ آگ کا الاؤ دکھائی دے رہا تھا۔ احمد نے ہولے سے کہا۔

"ندیم نے خود کو تباہ کر کے ہمیں بچا لیا۔"

اور واقعی اس نے سبھی کو بچا لیا تھا۔ وہ تیزی سے اس مشین کا پہیّہ گھُمارہا تھا جو اس جانب ڈیم کا دروازہ کھول دیتی تھی۔ دوسرے سرے پر موجود ملازموں نے جو چیونٹیوں کے خوف سے اس جانب سے چلے گئے تھے ہڑبڑا شور مچایا۔ مگر ندیم نے پرواہ نہ کی۔ وہ دروازہ کھولتا رہا۔

پانی پہلے تو آہستہ سے آیا اور پھر چیختا چنگھاڑتا ہوا پانی کا طوفان اس جانب بڑھا۔

وہ چیونٹیوں کے لشکر کی جانب بڑھا۔ یہ نئی آفت تھی جو سارے لشکر کو تباہ کر سکتی تھی۔ چیونٹیوں کی صفوں میں انتشار پیدا ہو گیا۔ وہ اِدھر اُدھر بھاگیں۔ خود کو بچانے کے لیے انہوں نے رُخ موڑ دیا مگر پانی کی رفتار خود ان کی رفتار سے تیز تھی۔ وہ بھاگتی رہیں اور پانی سارے لشکر کو اپنی لپیٹ میں لیتا رہا۔

ندیم انہیں دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ایک لمبا سانس لیا۔ اور خود کو پانی میں گرا دیا۔ پانی اسے بھی بہالے گیا اور اس کے جسم کی آگ بھی بجھ گئی۔

پانی پھیلتا گیا اور پندرہ میل کے علاقے میں زبردست سیلاب آ گیا۔ فارم پانی میں ڈوب گیا۔ چیونٹیاں پانی پر دھبّے بن کر مر گئیں۔ نو میل لمبا لشکر تباہ ہو گیا۔

مگر فارم والے افسردہ تھے۔ اور یہ سب افسردگی ندیم کی وجہ سے تھی جسے انہوں نے پانی میں ڈوبتے دیکھا تھا۔ نسرین کا رو رو کر برا حال تھا۔ اور اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ تمام کا تمام چیونٹیوں کا لشکر تباہ ہو گیا۔

مگر ڈیم کے پانی نکلنے کا دروازہ بند کرنا ضروری تھا۔ ملازمین جو ڈیم پر موجود تھے بھاگ گئے۔

جلد ہی یہ خبر حکومت کو مل گئی۔ ہوائی جہاز اور ہیلی کاپٹر ادھر اُمڈ پڑے اور بڑی مشکل سے مزید پانی کو روکا گیا۔ مگر وہ مطمئن تھے۔ انہوں نے کہا۔

”جس نے بھی یہ اقدام کیا وہ انتہائی دانش مندانہ تھا۔ تھوڑی مصیبت مول لے کر بہت بڑے خطرے سے بچ گئے۔“

اور پھر پانی اترنا شروع ہو گیا۔ اچانک احمد نے دیکھا کہ پانی میں انسانی لاش سی تیر رہی تھی۔ وہ اوپر سے کودا اور اسے نکال لایا۔ یہ ندیم تھا۔

وہ بے ہوش تھا۔ اس کا جسم بری طرح زخمی اور چلا ہوا تھا۔ سب نے مل کر اسے طبّی امداد دی۔ نسرین سب سے آگے تھی۔ پھر اسے ہوش آ گیا۔ اس نے کہا۔ ''کیا بنا؟''

''لشکر تباہ ہو گیا۔ ہم بچ گئے اور حکومت نے ڈیم کا پانی بند کر دیا ہے۔''

اس نے لمبا سانس لیا اور پھر بے ہوش ہو گیا۔ دو دن بعد پانی اترا۔ ندیم بھی درست تھا اسے ہسپتال لے جانے کی ضرورت تھی۔

جب پانی اترا تو حکومت کی کشتیاں امداد کو آئیں اور ندیم کو لے گئیں۔

ڈیم کے ملازمین نے ندیم کو شناخت کر لیا اور بتایا کہ پانی اس نے کھولا تھا۔ ندیم اب پھر مصیبت اور مقدمے کے لیے تیار تھا۔ مگر ایسا نہ ہوا۔

اسی شام ایک بڑے افسر نے اسے اطلاع دی کہ حکومت نے اس کی ذہانت اور جاں نثاری کے علاوہ ملک کو اس خطرے سے بچانے کے صلے میں اسے تمغۂ

جرات دیا ہے اور اس پر ٹیکس معاف کر دیے ہیں۔

خوشی سے سبھی کے چہرے چمک اٹھے اور ملازمین کے ندیم زندہ باد کے نعرے لگائے۔

واقعی ندیم کی جرأت مندی نے کمال کر دیا تھا۔ اس نے ایک بہت بڑے خطرے سے اس کو بچایا تھا اور اپنے فارم کو بھی۔

اس کا سامان، غلّہ اور مویشی بھی بچ گئے تھے اور جب ندیم صحت یاب ہو کر فارم پر آیا سبھی نے فارم کو خوب سجایا اور خوشی کا جشن منایا۔

ختم شد